یورپ کے تین ۳ معاشی نظام

جاگیرداری — سرمایہ داری — اشتراکیت

اور ان کا تاریخی پس منظر

مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ

ادارۃ المعارف کراچی

یورپ کے
تین۳ معاشی نظام

جاگیرداری، سرمایہ داری، اشتراکیت
اور ان کا تاریخی پس منظر

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ

اِدارۃُ المعارِف کراچی ۱۴

باہتمام : محمد مشتاق ہاشمی
طبع جدید : ذوالحجہ ۱۴۲۸ھ - دسمبر ۲۰۰۷ء
مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی
ناشر : اِدَارَۃُ المَعَارِف کراچی
فون : 5049733 - 5032020
ای میل : i_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

* اِدَارَۃُ المَعَارِف کراچی
فون: 5049733 - 5032020

* مکتبۂ معارف القرآن کراچی
فون: 5031565 - 5031566

فہرستِ مضامین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرضِ مؤلف

یہ مقالہ ناچیز نے اب سے تقریباً بتیس ۳۲ سال پہلے، اساتذہ دارالعلوم کراچی کی ''مجلسِ علمی'' کے لئے تحریر کیا تھا، اور اسی میں پڑھ کر سنایا گیا۔ اس زمانے میں، میں دارالعلوم کے متوسط اور عالی درجات کی تدریس اور اس کی تیاری میں ہمہ تن منہمک رہتا تھا اور تصنیف و تألیف کے لئے وقت مشکل ہی سے میسر آتا تھا۔ دارالعلوم کراچی کا ترجمان ماہنامہ ''البلاغ'' بھی اس وقت تک جاری نہیں ہوا تھا۔

پھر تقریباً پانچ سال بعد ۱۹۷۰ء میں یہ مقالہ ''البلاغ'' کی پانچ طویل قسطوں میں کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ شائع ہوا، قارئین نے پسندیدگی سے نوازا، مگر کتابی شکل میں اس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کو منظور ہی یہ تھا کہ جب یہ کتابی شکل میں شائع ہو تو سوشلزم کے عبرتناک انجام پر اور بعد میں پیدا ہونے والی فکر انگیز صورتِ حال پر بھی مشتمل ہو۔

اس طرح اب اسے آخر کے چند صفحات کے ضروری اضافے کے ساتھ ''ادارۃ المعارف کراچی'' سے پہلی بار کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے، دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ناچیز کاوش کو شرفِ قبول سے نوازے، قارئین کے لئے نافع، اور میرے لئے زادِ آخرت بنائے، اور اُمت کے قائدین کو اس پکار پر لبیک کہنے کی توفیق عطا فرمائے جو اب وقت کی عالمی پکار بن گئی ہے، اور کتاب کے آخر میں سپردِ قلم کردی گئی ہے، واللہ المستعان۔

۳ رمحرم ۱۴۱۸ھ
۱۱رمئی ۱۹۹۷ء

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
خادم دارالعلوم کراچی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ
اَجْمَعِیْنَ وَمَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْن

اس وقت دُنیا دو متضاد معاشی نظاموں سے دوچار ہے، تقریباً نصف دُنیا پر ''نظام سرمایہ داری'' (Capitalism) کی حکمرانی ہے تو باقی تقریباً نصف پر ''سوشلزم'' (Sochialism) اپنا لوہا منوا رہا ہے۔[1] کہیں کہیں ابھی تک ''جاگیرداری نظام'' مسلط ہے، خود پاکستانی عوام جاگیرداری اور سرمایہ داری نظاموں کی چکی میں پس رہے ہیں۔

اسلام جو صرف ''مذہب'' نہیں بلکہ ''دِین'' ہے، یعنی بنی نوع انسان کے لئے اللہ کا بھیجا ہوا مکمل دستورِ حیات ہے، اس کی فطری تعلیمات سے یہ تینوں نظام قدم قدم پر متصادم ہیں، اسلام اور خصوصاً اس کی معاشی تعلیمات کا مطالعہ کرنے

---

(۱) یاد رہے کہ یہ مقالہ اب سے ۳۲ سال پہلے، تقریباً ۱۹۶۵ء میں لکھا گیا تھا، جب سوشلزم کی طاقت عروج پر تھی، اور وہ باقی دُنیا کے لئے بھی حقیقی خطرہ بنا ہوا تھا، اب جبکہ وہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکا ہے، جہاد افغانستان کے نتیجے میں ۱۹۹۱ء سے رُوس کی ''سوویٹ یونین'' دُنیا کے نقشے سے غائب ہوچکی ہے، اور چین بھی کم از کم اس کے معاشی اُصولوں سے عملاً دست بردار ہوچکا ہے، سوشلزم ایک انقلابی طاقت یا معاشی نظام کے طور پر تو باقی نہیں رہا، لیکن رُوس اور چین اور ان کے مقبوضہ ممالک میں سوشلزم کی سیاسی قوت ایک حد تک موجود ہے، اور ایک ناکام نظریۂ حیات کے طور پر تو وہ بہرحال موجودہ تاریخ کا حصہ ہے۔ رفیع (مئی ۱۹۹۷ء)

والے کو یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ تصادم بنیادی طور پر کہاں کہاں ہے؟ خود ان نظاموں کا جاننا اور سمجھنا ضروری ہے۔ اس مقالے کا مقصد ان ہی تینوں نظاموں کا تعارف پیش کرنا ہے۔

چونکہ یورپ ہی ''نظامِ سرمایہ داری'' اور ''سوشلزم'' کی جائے پیدائش ہے، لہٰذا ہم پہلے یورپ کی تاریخ کا سرسری جائزہ لیں گے، تاکہ ان نظاموں کا پس منظر سامنے آسکے، اور ان کے مزاج اور نفسیاتی محرکات کو اچھی طرح سمجھا جاسکے۔ اس تاریخی جائزے میں مذہب عیسائیت یا ''پاپائیت'' کا وہ رُوپ بھی دیکھا جاسکے گا جس نے ان تینوں نظاموں کو پروان چڑھانے میں بنیادی کردار - شاید نادانستہ طور پر- ادا کیا ہے۔

عہدِ متوسط (قرونِ وسطیٰ)

کا یورپ

قرونِ وسطیٰ میں یورپ کی سیاسی حالت[1]

قرونِ وسطیٰ یعنی ۴۰۰ عیسوی سے ۱۳۰۰ عیسوی تک کا زمانہ یورپ کا تاریک ترین دور ہے۔ سیاسی، معاشی اور مذہبی حالات انتہائی ابتر ہو چکے تھے، اس دور میں یورپ کس سیاسی صورتِ حال سے دوچار تھا؟ اس کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل واقعات سے ہوگا۔

مسلمانوں کی فتوحات

چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں اسلام کا فطری دین عرب کی پہاڑیوں سے ایک انقلابی قوت بن کر نمودار ہوا۔ قرآن و سنت کی دلنشین حقانیت اور اسلام کی ظلم شکن تلوار نے ایک طرف ایران کے کسریٰ کا تخت و تاج اُلٹ کر وہاں کے عوام کو ظلم و ستم سے نجات دلائی تو دُوسری جانب شام، فلسطین، اُردن، لبنان وغیرہ سے یورپ کے کلیسائی اقتدار کا خاتمہ کر کے ان علاقوں کو ظلم و جہالت سے پاک کیا۔ اسلام کی متحرک قوت آگے بڑھی اور سرفروشانِ اسلام نے مصر، طرابلس (تریپولی) اور نصف صدی میں پورے شمالی افریقہ کو فتح کر کے انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے چھڑا کر انسانوں پر ان کے خالق کا قانون نافذ کر دیا۔ اور ۶۵۰ء میں وہ دیکھتے ہی دیکھتے یورپ کے عظیم ملک اسپین میں بھی اس کے نجات دہندہ بن کر پہنچ گئے، اس طرح یورپ کا ایک بڑا حصہ بھی مسلمانوں کی دسترس میں آگیا۔

---

(۱) اس عنوان کا مواد مختلف کتب تاریخ سے مأخوذ ہے، مثلاً ''تاریخ عالم''، ''تاریخ معاشیات'' از ڈاکٹر کیلس انگرام، ''جمہوریت اور مغربی تحریریں'' از ایڈورڈ بینس سابق صدر چیکوسلواکیہ وغیرہ۔

مجاہدین اسلام نے جزیرہ صقلیہ (سسلی) پر، اور کارسا، سارڈینا، اور اٹلی کے جنوبی حصوں پر بھی اسلام کے پرچم لہرادیئے۔

سلطنتِ روما کا انحطاط

سلطنت روما اس وقت دوہری مصیبت میں گرفتار تھی، ایک طرف تو اس کے بہترین صوبے اور زرخیز ممالک قبضے سے نکلتے جارہے تھے، جس کے باعث وہ روز بروز انحطاط کی گہرائیوں میں تیزی سے لڑھک رہی تھی، اس پر باہمی حسد و رقابت کی آگ، لاقانونیت اور خانہ جنگیوں نے اس کی رہی سہی قوت کا بھی خاتمہ کردیا۔ اس طرح ماضی کی یہ عظیم سلطنتِ روما یورپ کی چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں، ریاستوں اور جاگیرداروں میں بٹ کر رہ گئی۔

قرونِ وسطیٰ میں یورپ کی معاشی حالت(۱)

جاگیرداری نظام

اس پورے عہد میں یورپ کی معاشی زندگی پر جاگیرداری نظام مسلط تھا، کیونکہ اس زمانے میں یورپ کی پوری معاشی زندگی زرعی پیداوار پر موقوف اور صنعت و تجارت کالعدوم تھی۔ صنعت سے تو لوگوں کو خود ہی کوئی دلچسپی نہیں تھی، اور تجارتی کاروبار کی تمام راہیں مسدود ہوجانے کے دو سبب تھے۔ ایک تو یہ کہ عیسائی کیتھولک مذہب جو اس زمانے میں مذہبی قوت ہونے کے علاوہ سیاسی طاقت بھی سب سے زیادہ رکھتا تھا، وہ تجارت کے کاروبار کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا، تاجر پر اتنی پابندیاں عائد کردی جاتی تھیں کہ اس کے لئے اپنے کاروبار کو ترقی دینا یا زیادہ دیر تک چلانا ممکن نہ رہا تھا۔

---

(۱) اس عنوان کا بیشتر مواد ''تاریخ معاشیات'' سے لیا گیا ہے جس کا ترجمہ جامعہ عثمانیہ دکن سے چھپا ہے۔ ص:۳۴ و ۴۰۔

دُوسرا بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اس زمانے میں یورپ دُنیا کے دُوسرے براعظموں سے بالکل کٹا ہوا تھا، اس کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات پیدا کر سکے، کیونکہ تمام سمندری راستوں پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا۔

امریکہ اس وقت تک دریافت نہیں ہوا تھا، اسی طرح ہندوستان کا موجودہ راستہ بھی اس وقت تک یورپ دریافت نہ کر سکا تھا۔ ان دونوں اسباب کی بناء پر یورپ میں تجارت کے فروغ کا کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ اس لئے لامحالہ یورپ کی پوری معاشی زندگی کا انحصار زراعت اور زمین کی پیداوار پر ہوگیا۔ زمینوں کے حقوق اور کاشت کا جو ایک مخصوص نظام اس زمانے میں رائج تھا وہی ''جاگیرداری نظام'' کہلاتا تھا۔

جاگیرادری نظام کی حقیقت

اس نظام کی خصوصیات یہ ہیں:

۱- زمیندار اور جاگیردار تھوڑی تھوڑی زمین کسانوں کو کاشت کے لئے دیتے تھے اور ان سے جو پیداوار حاصل ہوتی اس کا ایک خاص حصہ جاگیردار کو اور ایک خاص حصہ کلیسا کو دے کر جو کچھ بچ رہتا وہ کسان کی ملکیت ہوتا تھا۔

۲- زمین ایک مرتبہ کاشتکار کے حوالہ کردینے کے بعد زمیندار واپس نہیں لے سکتا تھا، اسی طرح خود کاشتکار بھی اس زمین کو چھوڑ کر کہیں اور نہیں جا سکتا تھا۔

۳- جاگیردار کا فرض ہوتا تھا کہ وہ کاشتکار کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرے، اسی طرح کاشتکار کا فرض تھا کہ وہ وقت پڑنے پر اپنے آقا کو فوجی اور مالی امداد دے۔

۴- کاشتکار پر اور بھی کچھ محاصل لگائے جاتے تھے، عموماً ان محاصل کا بار اتنا زیادہ ہوتا تھا کہ وہ بمشکل اپنے اہل وعیال کا پیٹ پال سکتا تھا۔

۵- اگر جاگیردار کسی جنگ میں قید ہوجائے تو کاشتکار کا فرض تھا کہ وہ اپنے

آقا کا فدیہ ادا کر کے اسے چھڑائے۔

۶۔ اگر آقا کی لڑکی کی شادی ہو تو جہیز کا بڑا حصہ کاشتکار کے ذمہ تھا کہ وہ فراہم کرے۔

۷۔ جب آقا کا بڑا لڑکا سردار بنایا جاتا تو اس تقریب کے اخراجات بھی کاشتکاروں سے وصول کئے جاتے تھے۔

۸۔ یورپ کے بعض علاقوں مثلاً رُوس کے کاشتکار اپنے آقا کی مرضی کے بغیر شادی بھی نہیں کر سکتے تھے۔

۹۔ نظری طور پر پورے ملک کی زمین بادشاہ کی ملکیت سمجھی جاتی تھی اور کسی کو زمین کا مالک نہیں سمجھا جاتا تھا۔

۱۰۔ کاشتکار جس جاگیردار سے مذکورہ شرائط پر زمین لیتا تھا وہ جاگیردار اسی طرح کسی بڑے جاگیردار سے مشروط طور پر زمین لیتا تھا، بڑا جاگیردار بھی صحیح معنی میں اپنی زمین کا مالک نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ کسی بڑے نواب کا باج گزار ہوتا، اس طرح ایک سلسلہ قائم تھا جس کا بلند ترین نقطہ بادشاہ یا شہنشاہ کی ذات تھی۔

عملی حیثیت سے کاشتکار اور جاگیردار کا تعلق بالکل غلام اور آقا کا تھا، جو کاشتکار ایک مرتبہ ایک جاگیردار سے وابستہ ہوگیا، اب وہ اس سے آزاد ہو کر کہیں نہیں جا سکتا تھا، مرکزی حکومت اس قدر کمزور ہوگئی تھی کہ رعایا کے حقوق اور جان و مال کی حفاظت وہ براہِ راست نہیں کر سکتی تھی، بادشاہ کے برائے نام اختیارات صرف نوابوں اور راجاؤں تک محدود تھے، جاگیردار اس قدر طاقتور اور خودمختار ہو گئے تھے کہ بادشاہ ان کے اور کسانوں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ نفاذِ قانون کا کام بھی جاگیرداروں سے متعلق ہوگیا، چنانچہ جاگیردار اپنی رعیت کے باہمی نزاعات کا خود تصفیہ کرتے تھے۔

غرض یہ کہ جاگیردار کسانوں کے سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے تھے، اور

کسانوں کے لئے جاگیردار کا ہر ظلم و ستم برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں یورپ کی مذہبی حالت[1]

کلیسا کی اجارہ داری

اس پورے زمانے میں عیسائی کیتھولک کلیسا پورے یورپ کا مذہبی اجارہ دار تھا، اور یورپ کی حکومت اگرچہ چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں، ریاستوں اور جاگیروں میں بٹی ہوئی تھی، لیکن کلیسا کی مرکزیت اب بھی قائم تھی، پوری عیسائی دُنیا کا مذہبی محور اَب بھی یہی مرکزی کلیسا تھا۔ تمام زمینوں کی پیداوار میں، جو کاشتکار کی عرق ریزی کا نتیجہ ہوتی تھی، کلیسا کا ایک معقول حصہ متعین تھا۔ اس کے علاوہ نذرانوں کی صورت میں بھی کلیسا کو بھاری آمدنی ہوتی تھی، کلیسا کے سیاہ و سفید کا مالک پوپ ہوتا تھا۔

علم و حکمت پر پابندیاں

کلیسا نے خاص طور پر یہ اہتمام کیا تھا کہ صحیح مذہبی معلومات اور عقلی و فکری صلاحیتیں کسی وقت بھی عوام میں پیدا نہ ہوسکیں، مقامی اور علاقائی زبانوں میں انجیل کا ترجمہ کرنے کی ممانعت تھی۔

اذیت ناک ریاضتیں

توحید و تثلیث کے ناقابلِ حل معمے کے علاوہ نفس پرست مذہبی پیشواؤں نے عوام کو عجیب و غریب سخت اذیت ناک ریاضتوں میں مشغول کردیا تھا، ان ریاضتوں کے بغیر کوئی شخص دِین دار نہیں ہوسکتا تھا، تجارت کو مذہبی نقطۂ نگاہ سے ناپسند کیا جاتا تھا۔ غرض عیسائی مذہب وساوِس و اَوہام کا گورکھ دھندا بن چکا تھا، معمولی معمولی مذہبی مسائل پر کشت و خون ہو رہا تھا۔

---

(۱) اس عنوان کا پورا مواد پادری خورشید عالم کی کتاب ''تواریخ کلیسائے رومۃ الکبریٰ'' سے ماخوذ ہے۔

مینار پر کھڑے رہنا، ہاتھ پاؤں کو ساکت کرلینا، نفس کشی کا عام طریقہ بن چکا تھا، شادی بیاہ سے اجتناب مقدس عبادت تھی، عوام پوپ کی اندھی تقلید میں جکڑے ہوئے تھے۔[۱]

پوپ کا اقتدار

عوام پر بادشاہوں سے زیادہ پوپ کا رُعب بیٹھا ہوا تھا، جس کے باعث بڑے بڑے بادشاہ بھی پوپ کو ناراض کرنے سے ڈرتے تھے، ہر ملک کا بادشاہ ان کی خدمت میں نذرانے اور کلیسا کے لئے مقررہ ٹیکس بھیجنے پر مجبور تھا۔

لہٰذا پوپ[۲] کا اقتدار صرف مذہبی اُمور تک ہی محدود نہ تھا بلکہ درحقیقت اس زمانے میں یورپ کی سب سے بڑی سیاسی طاقت بھی پوپ ہی تھا۔

کلیسا کی مخصوص جائیدادوں کے علاوہ پوپ، تمام بشپ اور پادری اپنی الگ بڑی بڑی جاگیروں کے مالک تھے، اور ان وسیع و عریض زمینوں میں رہنے والے، کاشت کرنے والے کسان جو عملی طور پر غلامانہ زندگی گزار رہے تھے، پوپ اور کلیسا کی زبردست فوجی طاقت کا کام بھی دے رہے تھے۔[۳]

پوپ کے خدائی اختیارات

خدائی اختیارات پوپ نے اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے، لوگوں[۴] کو گناہوں سے پاک کرنے کا کلیسا نے ایک نیا طریقہ ایجاد کرلیا تھا، وہ یہ کہ کوئی کتنے ہی سنگین گناہ کا مرتکب ہوجائے، کسی غریب کو قتل کیا ہو، چوری یا زنا کیا ہو، وہ اس گناہ سے

---

(۱) دیکھئے: ''تواریخ کلیسائے رومۃ الکبریٰ'' ص:۱۵۴۔

(۲) ایضاً ص:۱۴۱۔

(۳) دیکھئے: اینگلز کی کتاب ''سوشلزم'' ص:۴۳۔

(۴) دیکھئے کتاب ''تواریخ کلیسائے رومۃ الکبریٰ'' ص:۱۴۲، باب ''پوپیت کا زوال اور نفاق عظیم'' ۱۲ منہ۔

اس طرح پاک ہوسکتا تھا کہ پوپ کو مقررہ قیمت دے کر "مغفرت نامہ" حاصل کرلے۔ جس کو یہ مغفرت نامہ مل گیا وہ دوزخ کی آگ سے آزاد سمجھا جاتا تھا۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں تو مغفرت ناموں کی یہ تجارت اتنی عام ہوگئی تھی کہ مال دار لوگ دھڑا دھڑ ان مغفرت ناموں کو خرید رہے تھے۔ اس طرح مال داروں کے لئے غریبوں پر مظالم توڑنے کے مواقع بھی حاصل ہوگئے تھے اور کلیسا کا خزانہ بھی معمور ہوتا چلا جارہا تھا۔

پوپ کی چیرہ دستیاں

غرض پوپ ایسی مطلق العنان طاقت تھی جس کے سامنے کسی کو پَر مارنے کی گنجائش نہ تھی، اور اگر کبھی کسی "بدبخت" نے کلیسا یا پوپ کی دھاندلیوں کے خلاف آواز بلند کی، یا عیسائی عقائد کے معموں کو عقل کی کسوٹی پر پَرکھنا چاہا، اسے فوراً "بدعتی" قرار دے دیا جاتا، "بدعتی" کی اصطلاح ایسے ہی افراد کے لئے استعمال کی جانے لگی تھی جو مذہبی اَحکام کی کوئی ایسی تعبیر کریں جو پوپ کی رائے کے خلاف ہو، یا جو کلیسا کے جابرانہ قوانین یا اس کے خلاف عقل اعتقادی گورکھ دھندوں سے اُلجھ جائیں۔

ایسے بدعتیوں کا کھوج لگانے کے لئے کلیسا کے جاسوس دُور دُور سفر کرتے تھے، پھر کسی بھی شخص کو قانونی طور پر "بدعتی" قرار دینے کے لئے جاسوس کا اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ "یہ بدعتی ہے"۔ بیکارڈی فرقے نے دیسی زبان میں انجیل کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی تو ان کو بدعتی قرار دیا گیا۔ جب بدعتی کلیسا سے خارج کئے جاتے تو حکومت ان سے حقوقِ شہریت چھین لیتی تھی، انہیں ملک بدر کیا جاتا تھا اور تمام املاک ضبط کرلی جاتی تھیں۔

پھر رفتہ رفتہ ایسے افراد کو انتہائی وحشیانہ طریقوں سے سزائے موت دی جانے لگی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱- پوپ کلیمنٹ (Clement) پنجم نے شاہ فرانس کے اشارے پر انہتر

راہب سپاہیوں پر مشرقی بدعتی ہونے کا الزام لگایا اور انہیں آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔

۲۔ انگلینڈ کے دو فلسفی فرقوں کاتھری اور ایلیبجنیز کے مبلغین کو ۱۱۶۶ء میں آکسفورڈ کے مقام پر بدعتی قرار دے کر شہر سے باہر برف میں دھکیل دیا گیا تاکہ یہ ابدی نیند سو جائیں، اور اکثر کو زندہ جلا دیا گیا۔

۳۔ ۱۰۲۲ء میں شاہ فرانس رابرٹ (Robert) نے تیرہ کاتھری اپنی موجودگی میں زندہ جلوا دیئے اور بعض کاتھریوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔

پادری خورشید عالم نے اپنی کتاب ''تواریخ کلیسائے رومۃ الکبریٰ'' میں اس قسم کی چیرہ دستیوں کے متعدد لرزہ خیز واقعات بیان کئے ہیں، تفصیل ص: ۱۴۰ سے ۱۶۲ تک کے صفحات میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

ظاہر ہے علوم و فنون پر اتنے سخت پہروں کی موجودگی میں کسی علم و فن کے پنپنے کا دُور دُور بھی امکان نہ تھا۔

ان تمام چیرہ دستیوں کی تان جس طبقے پر سب سے زیادہ ٹوٹتی تھی وہ کسانوں کا طبقہ تھا، وہ دوہرے مظالم کا شکار تھے۔ ایک طرف جاگیرداروں کا سنگدل طبقہ ان کا خون چوس رہا تھا، اور دُوسری طرف سے کلیسا کے محافظ ان کی ہڈیوں کا گودا نکال رہے تھے، یہ چکی کے دو پاٹ تھے جن کے درمیان یورپ کے مظلوم عوام ایک ہزار سال تک پستے رہے۔

دہقان ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
جاں بھی گروِ غیر بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
(شاعرِ مشرق)

عہدِ جدید کا آغاز

جاگیرداری نظام کا زوال اور اس کے اسباب[(۱)]

تیرھویں اور چودھویں صدی میں یورپ کے حالات نے ایک نئی کروٹ لینی شروع کی، جس نے بالآخر جاگیرداری نظام کا خاتمہ کردیا۔

صلیبی جنگیں

ان تبدیلیوں کا خاص سبب صلیبی جنگیں تھیں، جو اسلام اور عیسائیت کے درمیان لڑی جارہی تھیں۔

صلیبی جنگوں کے درمیان مشرقی بحیرہ روم سے مسلمانوں کا تسلط ختم ہوگیا، اور اس کے بڑے بڑے جزائر صقلیہ، قبرص اور رھوڈس پر اہلِ یورپ قابض ہوگئے۔

ان جنگوں کے باعث یورپ کی جہازرانی اور تجارت کو بڑی ترقی ہوئی اور تاجروں کا ایک بڑا طبقہ وجود میں آگیا، جس کا کام یہ تھا کہ وہ ان زائرین اور افواج کے لئے ضروری اشیاء فراہم کرے جو ارضِ مقدس (بیت المقدس) میں قیام پذیر تھیں۔

ساہوکاروں کا طبقہ

اسی طرح ساہوکاروں کا ایک طبقہ وجود میں آیا جو اکثر شہروں میں آباد تھا، یہ صلیبی جنگوں میں شرکت کرنے والے فوجی سرداروں، اور جاگیرداروں کو مالی امداد بطور قرض دیا کرتا تھا۔ اس امداد کے معاوضے میں اکثر شہروں نے جاگیرداروں سے آزادی حاصل کرلی، اس طرح شہروں کی بہت بڑی تعداد جاگیرداروں کے تسلط سے

---

(۱) اس عنوان کا بیشتر مواد کتاب ''عربوں کا عروج و زوال'' اور کتاب ''جمہوریت اور مغربی تحریکیں'' سے ماخوذ ہے۔

آزاد ہوکر ساہوکاروں کے قبضے میں چلی گئی۔ تجارت کے فروغ اور سرمایہ داروں کے اس نئے طبقے نے رفتہ رفتہ جاگیرداروں کی قوت کو مضمحل کردیا۔

وسائلِ آمد و رفت کی ترقی

اس پر مستزاد یہ کہ وسائلِ آمد و رفت کی ترقی کے باعث ہر ملک کے لوگوں کا ربط و ضبط آپس میں بڑھنے لگا، جس نے کسانوں میں جاگیرداروں کی حمایت کا احساس ختم کرکے ان میں قومی وفاداری کا جذبہ پیدا کیا۔

صلیبی جنگوں نے بھی اس قومی جذبے کو پیدا کرنے میں بہت مدد دی۔

عوامی اضطراب

یورپ کے عوام جاگیرداروں کی چیرہ دستیوں، اور ان کے مالی مطالبات سے تنگ آچکے تھے، ادھر بادشاہ بھی جاگیرداروں کی خودسری سے پریشان تھے، اور انہیں پورے طور پر اپنا محکوم بنانا چاہتے تھے، اس طرح اب یورپ کے ہر ملک میں بادشاہوں اور جاگیرداروں کے درمیان کشمکش کا آغاز ہوا۔

مرکزی حکومتوں کا استحکام

عوام نے جاگیرداروں سے نجات حاصل کرنے کے لئے بادشاہوں کی تائید کی، اور رفتہ رفتہ یورپ کے اکثر ممالک، خصوصاً انگلستان اور فرانس میں مضبوط مرکزی حکومتیں قائم ہوگئیں، جنھوں نے جاگیرداروں کی سرکشی کا خاتمہ کردیا۔ ان بادشاہوں نے تجارت وصنعت کو اپنی سرپرستی میں لے کر انہیں خوب فروغ دیا تاکہ محاصل وغیرہ کے ذریعہ شاہی خزانے کو زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل ہو اور توسیعِ مملکت کے لئے بڑی بڑی فوجیں ملازم رکھی جاسکیں۔

اندلس میں مسلمانوں کا زوال

۱۴۹۲ء میں یورپ کے بہترین ملک اندلس میں ایک بڑا انقلاب رُونما ہوا،

مسلمانوں کی جو عظیم الشان حکومت وہاں آٹھ سو سال سے قائم تھی، عیسائی بادشاہ فرڈی ننڈ (Ferdi Nand) اور ملکہ ازابیلا (Isabella) کی مجموعی طاقت نے مل کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح یہاں بھی ایک مضبوط بادشاہت قائم ہوگئی۔

قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا قبضہ اور اس کے نتائج

۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر مسلمان ترکوں کا قبضہ ہوگیا اور مسلمان آبنائے باسفورس سمیت ان بحری راستوں پر قابض ہوگئے جن سے اہلِ یورپ کو مشرقی ممالک سے تجارت کے لئے گزرنا پڑتا تھا، لہٰذا اہلِ یورپ نے نئے بحری راستوں کی تلاش شروع کر دی۔

ہندوستان اور امریکہ کے بحری راستوں کی دریافت

۱۵۹۸ء میں واسکوڈی گاما (Vascode Gama) نے طویل جستجو کے بعد ہندوستان کا بحری راستہ معلوم کرلیا، اور اس کے نتیجے میں پہلی مرتبہ اہلِ مغرب نے سرزمینِ ہندوستان پر قدم رکھا۔

اسی کے بعد مشہور سیاح کولمبس (Columbus) نے اندلس کے بادشاہ اور ملکہ کی سرپرستی میں امریکہ کا نیا براعظم دریافت کیا۔

صنعتی انقلاب

امریکہ کی دریافت اور ہندوستان کے بحری راستوں کی کامیاب تلاش نے یورپ اور ایشیا کے مستقبل پر بڑے گہرے اثرات مرتب کئے۔

امریکہ سے سونے اور چاندی کی درآمد بڑی مقدار میں شروع ہوگئی۔ فنِ جہاز رانی میں زبردست ترقیاں عمل میں آئیں۔ تجارت، صنعت اور زراعت میں انگلستان کی زرعی اور صنعتی زندگی میں وہ عظیم الشان تبدیلیاں شروع ہوئیں جنہیں مجموعی حیثیت سے "صنعتی انقلاب" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس صنعتی انقلاب کی وجہ سے اہل

یورپ کے سامنے تجارتی اور صنعتی ترقی کا ایک وسیع میدان کھل گیا۔

زراعت کے نئے نئے آلات اور طریقے دریافت کئے گئے، ان طریقوں پر صرف بڑے بڑے زمیندار ہی زراعت کر سکتے تھے، اس لئے چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں نے اپنی زمینیں فروخت کر کے شہروں کا رُخ کیا، جہاں نئی نئی صنعتوں میں مزدوروں کی حیثیت سے ان کی کھپت ہونے لگی۔

شہری آبادی میں اضافہ

بڑے بڑے نئے شہر آباد ہوئے اور صنعتوں کی وجہ سے شہروں میں مزدوروں کی آبادی روز بروز بڑھنے لگی، اس طرح قرونِ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام نے سولہویں[1] صدی میں بدلے ہوئے حالات کے سامنے دَم توڑ دیا، اور اس کے کھنڈروں پر خود مختار شاہی کی بنیاد پڑنے لگی۔

خود مختار شاہی کا دور[2]

جاگیرداری نظام کے خاتمے کے بعد یورپ میں سترھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک خود مختار شاہی اپنے پورے غلبے اور جبر و استبداد کے ساتھ متمکن رہی۔ اس دور میں بادشاہ کا اقتدار، کلیسا کے اقتدار اور نوابوں کے حقوق پر چھایا رہا۔ نمائندہ مجلسوں کے اثر ونفوذ کا خاتمہ کر دیا گیا، حکمرانی کے تمام اختیارات پر بادشاہ قابض رہے۔ ان کے لئے ضروری نہیں تھا کہ بجز اپنے کسی اور کے سامنے اپنے اعمال کا حساب پیش کریں۔ وہ نواب اور جاگیردار جن کا اثر ونفوذ مسلسل گھٹ رہا تھا، ان کے لئے سوائے فوج اور حکومت کے رشتے میں منسلک ہونے کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

---

(۱) ''تاریخ معاشیات'' ص:۴۸، و ''جمہوریت اور مغربی تحریکیں''۔

(۲) اس عنوان کا پورا مواد ''جمہوریت اور مغربی تحریکیں'' سے مأخوذ ہے۔

علاوہ ازیں اس دور میں مفکرین اور فلاسفہ کا ایک گروہ پیدا ہوا جو مطلق العنان شاہی نظام کے دفاع میں اپنے افکار پھیلانے لگا، اس گروہ میں سب سے نمایاں شخصیت ''ہوبز'' (Hobbs) کی ہے۔

اس دور میں عوام کی حالت

فرد کی جو حالت جاگیردارانہ نظام میں تھی اس سے بہتر شہنشاہی نظام کے سایہ تلے نہ تھی، عوام کو نہ تو سیاسی حقوق حاصل تھے اور نہ شخصی، بلکہ فرد کے لئے یہ ضروری تھا کہ اپنی ذاتی ضرورتوں اور مصلحتوں کو شہنشاہیت کی مصلحتوں پر قربان کردے۔ فطری حقوق کا اعتراف کرنا تو اس شہنشاہیت کی شان کے خلاف تھا۔

اس دور میں یورپ کی مذہبی حالت

یورپ میں جس طرح جاگیرداری نظام کی چیرہ دستیاں خود اسی کے لئے موت کا پیغام ثابت ہوئیں، بالکل اسی طرح کلیسا کے لرزہ خیز مظالم اور نام نہاد مذہبی پیشواؤں کی تنگ نظری اور نفس پرستی بالآخر ان کے لئے خودکشی بن کر رہی۔ کیونکہ یورپ کے تعلیم یافتہ طبقے میں سیاسی اور معاشی ترقیوں کے ساتھ ساتھ وہ ذہنی جمود ٹوٹ رہا تھا جو ایک ہزار سال سے ان پر چھایا ہوا تھا، اب اصلاحِ مذہب، جدید سائنسی تحقیقات اور فلسفے میں نئے افکار ونظریات کی ایک زبردست تحریک جنم لے چکی تھی۔

کلیسا کے خلاف تحریک

پوپ اور کلیسا نے ابتداء میں اس نئی علمی تحریک کی شدید مخالفت کی، اسے روکنے کے لئے مذہبی عدالتیں قائم کی گئیں، جنھوں نے اس تحریک کے علم برداروں کو سخت ترین سزائیں دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ۱۴۱۵ء میں اس تحریک کا ایک علم بردار ''جان ہس'' (John Huss) کانسٹینس کے مقام پر نذرِ آتش کیا گیا،

اور ۱۴۱۶ء میں اس کے شاگرد جیروم (Jerome) کو بھی زندہ جلا دیا گیا۔[1]
لیکن یہ تحریک حقیقی بیداری کا نتیجہ تھی، اس لئے تشدّد سے دبنے کے بجائے بڑھتی چلی گئی، تا آنکہ آزادئ فکر کے سیلاب نے مذہبی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔

مذہب سے بیزاری

ابتداء میں یہ جنگ صرف پوپ اور کلیسا کے خلاف لڑی گئی تھی، لیکن چونکہ کلیسا آزاد خیالوں سے مذہب کے نام پر جنگ کر رہا تھا اس لئے رفتہ رفتہ یہ نئی تحریک پورے مسیحی مذہب کے خلاف ہوگئی، اور چونکہ اہلِ یورپ نے مسیحی مذہب کے علاوہ قریب سے کسی دُوسرے مذہب کو دیکھا ہی نہ تھا اس لئے وہ دُنیا کے ہر مذہب کو اپنا، عقل کا، اور دُنیا کی تمام ترقیوں کا دُشمن سمجھنے لگے، اور پورے یورپ میں یہ تأثر سختی سے قائم ہوگیا کہ ''مذہب ہماری ہر ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ ہے''۔

پروٹسٹنٹ (Protestant) فرقے کا ظہور

ان حالات میں عیسائی مذہب کا خاتمہ ہونے ہی والا تھا کہ عیسائیوں کا ایک نیا فرقہ پروٹسٹنٹ نمودار ہوا، اور اس نے یہ پالیسی اختیار کی کہ عیسائی مذہب کو نسبتاً آسان بنادیا، جدید علمی تحقیقات کو سراہا، دُنیاوی کاروبار کو مذہب کی قید سے آزاد کیا، قوم کی باغیانہ تحریکوں اور مخالفانہ عناصر کا مقابلہ کرنے میں حکومت کی تائید و حمایت کو اپنا شعار بنایا، اور بڑے بڑے رئیسوں اور بادشاہوں کے دامن میں پناہ لے کر ان کی ہر ناجائز حرکت کو جائز قرار دینے لگا، اور ان خدمات کے عوض بھاری رشوتیں[2] اس کا ذریعہ معاش بن گئیں۔

---

(۱) ''تواریخ کلیسائے رومۃ الکبریٰ'' ص:۱۷۷۔
(۲) ''جمہوریت اور مغربی تحریکیں'' ص:۴۲۔

اس طرح پروٹسٹنٹ مذہب کا لباس پہن کر نصرانیت نے حکمرانوں کی آغوش میں زندہ رہنے کے ڈھنگ تو کر لئے لیکن اس کی آبرو جو لُٹ رہی تھی لُٹتی ہی چلی گئی۔

مذہب دشمنی

آزادیٔ فکر کے علم برداروں نے اسلام کی روشنی کو تو دیکھا ہی نہ تھا، اس لئے انہوں نے عیسائیت کو چھوڑ کر بالکل دوسری انتہا پر پہنچ کر دم لیا، وہ سرے سے خدا کے وجود ہی کا انکار کر بیٹھے، اور یہ نظریہ قوی تر ہو گیا کہ:

> مذہب کا کوئی حقیقی وجود نہیں بلکہ یہ من گھڑت قصہ کہانیوں کا مجموعہ ہے جسے مذہبی پیشوا اپنی نفسانی اغراض کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں۔

اس کے بعد یورپ میں جتنے فلسفوں اور نظریات نے جنم لیا وہ سراسر مادّیت، دہریت اور الحاد پر مبنی تھے، جتنے معاشرے قائم ہوئے وہ مذہب اور قدیم روایات کی ہر قید سے آزاد تھے، اور جتنے سیاسی انقلابات رُونما ہوئے وہ مذہب کے اقتدار اور اخلاق کی قدیم روایات کو فنا کرتے چلے گئے۔

نظامِ سرمایہ داری
(Capitalism)

اٹھارویں صدی عیسوی میں صنعتی انقلاب نہایت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا، زندگی کے ہر شعبے میں ایسی عجیب وغریب ایجادات ہو رہی تھیں جنھوں نے یورپ کی پوری زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا۔ بھاپ اور بجلی کے استعمال سے صنعت و حرفت اور زراعت ومواصلات میں زبردست انقلاب آچکا تھا۔ دستکاریوں کی بجائے اب ہر جگہ عظیم الشان مل اور کارخانے قائم ہو رہے تھے، جہاں بے شمار انسانوں کی کھپت ہونے لگی، اور غریب عوام کی اکثریت نے گاؤں چھوڑ چھوڑ کر روزگار حاصل کرنے کے لئے شہروں کا رُخ کرلیا۔ اس طرح قصبات اور چھوٹے شہروں کی جگہ نہایت عظیم الشان شہر وجود میں آگئے۔

مگر خالص مادّی اور لادِینی بنیادوں پر حاصل کی جانے والی یہی صنعتی ترقی اس عیارانہ نظام سرمایہ داری (Capitalism) کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، جس کے بے رحم جال میں پھنسنے کے بعد عوام کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ موت اس جال کی گرفت میں زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے یا جاگیرداری نظام کی اس چکی میں جس کے درمیان وہ کئی سو سال تک پستے رہے تھے۔

صنعتی انقلاب اور اس کی پیدا کردہ خوشحالی پر سود، سٹے اور قمار وغیرہ کے ذریعہ چند سرمایہ دار اور مہاجن سانپ بن کر بیٹھ گئے، انہوں نے صنعت وتجارت کا جو

نظام قائم کیا، اسی کو ''نظامِ سرمایہ داری'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ نظام کن بنیادوں پر قائم ہوا، اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟ ایک نظر اس پر بھی ڈال لینا ازبس ضروری ہے۔

نظامِ سرمایہ داری کی حقیقت

اس نظام کا بنیادی اُصول ''بے قید مشقت'' ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ صنعت وتجارت اور کسبِ معاش کے تمام طریقے اور معاشیات کا پورا نظام ہر قسم کے سرکاری قانون اور مذہبی پابندیوں سے کامل طور پر آزاد ہونے چاہئیں، حکومت اور مذہب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی فرد کے معاشی اور اقتصادی نظام میں کسی قسم کی مداخلت کرے۔[۱]

فرد کی حد سے بڑھی ہوئی یہ آزادی اس مفروضے پر قائم ہے کہ ہر شخص اپنے اچھے بُرے کی سمجھ خود رکھتا ہے، اس کو یہ بتانے کی نہ حکومت کو ضرورت ہے کہ وہ اپنا معاشی کاروبار کیسے چلائے، اور نہ کسی معلّمِ اخلاق کی ضرورت ہے جو حرص وطمع سے باز رہنے اور ایثار وسخاوت جیسی صفات کی تلقین کرے، رہا مذہب تو وہ ایک ڈھونگ ہے جس کی پیروی آزادئ فکر کے اس دور میں ایک مہذّب انسان کو زیب نہیں دیتی۔

چنانچہ اس نظام میں انفرادی ملکیت خواہ وسائلِ پیداوار (مثلاً زمین، مالِ تجارت، مشین اور خام پیداوار وغیرہ) کی ہو یا عام اشیاء کی، کامل طور پر آزاد ہوتی

---

(۱) واضح رہے کہ یہاں گفتگو نظامِ سرمایہ داری کے اصل فلسفے سے ہو رہی ہے، اس کی رائج الوقت صورتوں سے نہیں، بعد کے حالات سے مجبور ہو کر مختلف ممالک نے اس نظام میں کچھ ترمیم شروع کی جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے، صنعت وتجارت کے معاملات میں حکومت کا دخل بڑھ رہا ہے اور فرد کی آزادی گھٹ رہی ہے، تاہم یہ ترمیمیں ایسی جزوی اور غیر مؤثر ہیں کہ ان سے معاشرے کے مجموعی حالات پر کوئی گہرا اثر مرتب نہیں ہوتا اور وہ اُلجھنیں ختم نہیں ہوتیں جن سے اس نظام کا خمیر تیار ہوا ہے۔ ۱۲ رفیع

ہے۔ لین دین کی کوئی صورت جو طرفین کی رضامندی سے طے پا جائے، اسے روکنے کا اختیار نہ مذہب کو ہے، نہ کسی حکومت کو، تجارت وصنعت یا ملازمت ومزدوری وغیرہ کے ذریعہ نفع اندوزی پر کسی قسم کی قانونی یا مذہبی تحدید عائد نہیں کی جاسکتی۔ افراد کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے کہ اپنی پیداوار کو جس قدر چاہیں گھٹائیں یا بڑھائیں، مال کی جو قیمت اور اس پر جتنا منافع چاہیں حاصل کریں، پیداوار جس قسم کی چاہیں تیار کریں، اور کاروبار کے لئے جو ضابطے چاہیں مقرر کریں۔

اس نظام میں بنیادی چیز جس کو پورے معاشی نظام کی رُوح قرار دیا گیا ہے، وہ ہر کاروباری کا ذاتی نفع ہے، یعنی کاروباری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی تجارت وصنعت میں ملک وقوم کے نفع نقصان کو بھی پیشِ نظر رکھے، بلکہ ہر وہ پالیسی اختیار کرسکتا ہے جو خود اس کے لئے مفید ہو، ملک وقوم کو اس سے فائدہ کی بجائے اگر نقصان پہنچتا ہو تو فرد اس کا جوابدہ نہیں۔

جس طرح اس نظام میں ''انفرادی ملکیت'' حاصل کرنے کے تمام ذرائع میں فرد کو آزاد چھوڑا گیا ہے، اسی طرح خرچ کرنے کے معاملے میں بھی اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی، مذہب یا قانون کسی سے یہ مطالبہ نہیں کرسکتا کہ وہ اپنی دولت کا کوئی بھی حصہ ایسے مد میں خرچ کرے جس میں وہ اپنا مادّی نفع نہیں دیکھتا۔

نظامِ سرمایہ داری کے اثرات

اس نظام کے اثرات جو ملک وقوم پر پڑتے ہیں ان کا سرسری خاکہ یہ ہے:-

۱- مذہب کو نظامِ سیاست ومعیشت سے خالی ہاتھ کرکے گرجاؤں، مسجدوں اور خانقاہوں میں گوشہ نشین کردیا جاتا ہے تاکہ وہ ناجائز نفع اندوزی میں رُکاوٹ نہ بن سکے۔

۲- اس نظام میں تجارت وصنعت اور دولت کی گردش، سود، سٹہ، قمار اور آڑھت کی بنیادوں پر ہوتی ہے، ان چار چیزوں کے منطقی نتیجے کے طور پر پورے ملک

کے وسائل پیداوار اور دولت کے تمام خزانے چند ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ میں سمٹ کر جمع ہو جاتے ہیں۔

۳- بڑے سرمایہ دار چھوٹے چھوٹے تاجروں کو اس قابل نہیں چھوڑتے کہ وہ اپنے کاروبار کو ترقی دے سکیں یا باقی رکھ سکیں، بالآخر چھوٹے تاجر اور چھوٹے کارخانے یا تو روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں، یا بڑے سرمایہ داروں کی تجارتی پالیسیوں کے تابع محض ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

۴- غریب کی غربت اور سرمایہ داری کی دولت روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہے اور متوسط طبقہ روز بروز کم اور بے دست و پا ہوتا چلا جاتا ہے۔ معیارِ زندگی اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ متوسط طبقے کے لوگ اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہونے کے باوجود اس کا ساتھ نہیں دے سکتے، جس سے اَن گنت معاشرتی اُلجھنیں پیدا ہو کر معاشرے کو گھن لگ جاتا ہے۔

۵- گھریلو صنعتوں اور دستکاریوں سے تیار ہونے والا مال ملوں کی پیداوار کا مقابلہ نہیں کر پاتا، اس کے سامنے گھریلو صنعتیں اور دستکاریاں دَم توڑ دیتی ہیں اور دستکار اپنا آزاد پیشہ چھوڑ کر مزدوری یا ملازمت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ملازمت اور مزدوری کے طلب گاروں میں روز بروز اضافہ ہوتا ہے، لیکن مشین کے روز افزوں استعمال کے باعث انسانی محنت کی کھپت روز بروز کم ہونے لگتی ہے، جس سے پورے ملک میں بے روزگاری طوفانی رفتار سے بڑھتی چلی جاتی ہے، لازمی نتیجے کے طور پر مزدور کم سے کم اُجرت پر زیادہ سے زیادہ محنت کا سودا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ملک کی کل آبادی دو طبقوں میں بٹ جاتی ہے ایک طبقہ سرمایہ داروں کا، دُوسرا مزدوروں کا، یہیں سے سرمایہ دار اور مزدور کی طبقاتی کشمکش کا آغاز ہوتا ہے۔

پوری دولت اور وسائلِ پیداوار سرمایہ داروں کے قبضے میں چلے جانے کے

ہے۔ لین دین کی کوئی صورت جو طرفین کی رضامندی سے طے پا جائے، اسے روکنے کا اختیار نہ مذہب کو ہے، نہ کسی حکومت کو، تجارت وصنعت یا ملازمت ومزدوری وغیرہ کے ذریعہ نفع اندوزی پر کسی قسم کی قانونی یا مذہبی تحدید عائد نہیں کی جاسکتی۔ افراد کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے کہ اپنی پیداوار کو جس قدر چاہیں گھٹائیں یا بڑھائیں، مال کی جو قیمت اور اس پر جتنا منافع چاہیں حاصل کریں، پیداوار جس قسم کی چاہیں تیار کریں، اور کاروبار کے لئے جو ضابطے چاہیں مقرر کریں۔

اس نظام میں بنیادی چیز جس کو پورے معاشی نظام کی رُوح قرار دیا گیا ہے، وہ ہر کاروباری کا ذاتی نفع ہے، یعنی کاروباری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی تجارت وصنعت میں ملک وقوم کے نفع نقصان کو بھی پیشِ نظر رکھے، بلکہ ہر وہ پالیسی اختیار کرسکتا ہے جو خود اس کے لئے مفید ہو، ملک وقوم کو اس سے فائدہ کی بجائے اگر نقصان پہنچتا ہو تو فرد اس کا جوابدہ نہیں۔

جس طرح اس نظام میں ''انفرادی ملکیت'' حاصل کرنے کے تمام ذرائع میں فرد کو آزاد چھوڑا گیا ہے، اسی طرح خرچ کرنے کے معاملے میں بھی اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی، مذہب یا قانون کسی سے یہ مطالبہ نہیں کرسکتا کہ وہ اپنی دولت کا کوئی بھی حصہ ایسے مد میں خرچ کرے جس میں وہ اپنا مادّی نفع نہیں دیکھتا۔

نظامِ سرمایہ داری کے اثرات

اس نظام کے اثرات جو ملک وقوم پر پڑتے ہیں ان کا سرسری خاکہ یہ ہے:-

۱- مذہب کو نظامِ سیاست ومعیشت سے خالی ہاتھ کر کے گرجاؤں، مسجدوں اور خانقاہوں میں گوشہ نشین کردیا جاتا ہے تاکہ وہ ناجائز نفع اندوزی میں رُکاوٹ نہ بن سکے۔

۲- اس نظام میں تجارت وصنعت اور دولت کی گردش، سود، سٹہ، قمار اور آڑھت کی بنیادوں پر ہوتی ہے، ان چار چیزوں کے منطقی نتیجے کے طور پر پورے ملک

کے وسائلِ پیداوار اور دولت کے تمام خزانے چند ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ میں سمٹ کر جمع ہوجاتے ہیں۔

۳- بڑے سرمایہ دار چھوٹے چھوٹے تاجروں کو اس قابل نہیں چھوڑتے کہ وہ اپنے کاروبار کو ترقی دے سکیں یا باقی رکھ سکیں، بالآخر چھوٹے تاجر اور چھوٹے کارخانے یا تو روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں، یا بڑے سرمایہ داروں کی تجارتی پالیسیوں کے تابع محض ہوکر زندگی گزارنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

۴-غریب کی غربت اور سرمایہ داری کی دولت روز بروز بڑھی چلی جاتی ہے اور متوسط طبقہ روز بروز کم اور بے دست و پا ہوتا چلا جاتا ہے۔ معیارِ زندگی اتنا بلند ہوجاتا ہے کہ متوسط طبقے کے لوگ اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہونے کے باوجود اس کا ساتھ نہیں دے سکتے، جس سے اَن گنت معاشرتی اُلجھنیں پیدا ہوکر معاشرے کو گھن لگ جاتا ہے۔

۵- گھریلو صنعتوں اور دستکاریوں سے تیار ہونے والا مال ملوں کی پیداوار کا مقابلہ نہیں کر پاتا، اس کے سامنے گھریلو صنعتیں اور دستکاریاں دَم توڑ دیتی ہیں اور دستکار اپنا آزاد پیشہ چھوڑ کر مزدوری یا ملازمت کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

ملازمت اور مزدوری کے طلب گاروں میں روز بروز اضافہ ہوتا ہے، لیکن مشین کے روز افزوں استعمال کے باعث انسانی محنت کی کھپت روز بروز کم ہونے لگتی ہے، جس سے پورے ملک میں بے روزگاری طوفانی رفتار سے بڑھتی چلی جاتی ہے، لازمی نتیجے کے طور پر مزدور کم سے کم اُجرت پر زیادہ سے زیادہ محنت کا سودا کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

ملک کی کل آبادی دو طبقوں میں بٹ جاتی ہے ایک طبقہ سرمایہ داروں کا، دُوسرا مزدوروں کا، یہیں سے سرمایہ دار اور مزدور کی طبقاتی کشمکش کا آغاز ہوتا ہے۔

پوری دولت اور وسائلِ پیداوار سرمایہ داروں کے قبضے میں چلے جانے کے

باعث وہی پورے ملک کی تجارت وصنعت اور بازار کے اُتار چڑھاؤ پر قابض ہوجاتے ہیں۔ اشیائے ضرورت کا مصنوعی قحط مسلط کرکے عوام سے ان کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کی جاتی ہے، اور غریب آدمی کے لئے زندگی ایسا ناسور بن جاتی ہے جس کے ہر حصے میں ٹیسوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔

کارخانوں میں صرف وہی مصنوعات تیار ہونے لگتی ہیں جن میں سرمایہ دار کا زیادہ سے زیادہ نفع ہو، ملک وقوم کا فائدہ سرمایہ دار کے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ بسااوقات ایسی بیکار بلکہ مضر اشیاء کو تجارتی منصوبہ بندی کے تحت فیشن بنادیا جاتا ہے جو پوری قوم کی صحت واخلاق کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہیں۔

بسااوقات سرمایہ دار طبقہ جو گنے چنے افراد پر مشتمل ہوتا ہے محض سرمایہ کے زور سے حکومت کی پوری پالیسی کو اپنی حکمتِ عملی کے تابع کرلیتا ہے، اور عوام کی داد فریاد کوئی سننے والا باقی نہیں بچتا۔

یہ نظام پوری سوسائٹی اور اس کے تمدن کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے، صرف مال داری ہی ہر عزّت وشرف کا معیار بن جاتی ہے۔ علم، عقل اور اعلیٰ اخلاق کے بجائے انسان کی قدر ومنزلت اس کے بینک بیلنس سے پہچانی جاتی ہے۔ افراد کو صرف کھانے کمانے کی دُھن ہوجاتی ہے۔ خود غرضی، سنگ دِلی، عیاشی اور اخلاقی دیوالیہ پن اس نظام کا ایسا خاصہ ہے جو اس سے کبھی جدا نہیں ہوتا۔

اس نظام میں محنت پیشہ انسان کو جو گری پڑی اُجرت اور برائے نام سہولتیں حاصل ہوتی ہیں، وہ اس بنیاد پر نہیں کہ یہ انسان ہے بلکہ محض اس بنیاد پر کہ یہ سرمایہ دار کے سرمایہ میں اضافے کا ایک آلہ ہے۔ چنانچہ اس نظام میں ایسے افراد کی زندگی اور معاش کا کوئی انتظام نہیں ہوتا جو خلقی طور پر ہی محنت کے قابل نہ ہوں، یا کسی حادثے کے باعث محنت کے قابل نہ رہے ہوں، یا بڑھاپے کی اس حد پر پہنچ گئے ہوں جہاں سب اعضاء جواب دے جاتے ہیں اور صرف پیٹ کا مطالبہ باقی رہ جاتا ہے۔

یہی وہ اُلجھنیں تھیں جنہیں لے کر نظامِ سرمایہ داری یورپ میں پروان چڑھ رہا تھا۔

جمہوریت کا دور

یورپ میں جو معاشی تبدیلیاں تیزی سے رُونما ہو رہی تھیں، ان کے پہلو بہ پہلو میدانِ سیاست میں بھی ایک ہمہ گیر انقلاب انگڑائیاں لے رہا تھا، یورپ کے عوام جو ایک ہزار سال تک نظامِ جاگیرداری اور کلیسا کی چکی میں پسنے کے بعد پچھلے دو سو سال سے خود مختار شاہی کے شکنجے میں کسے ہوئے تھے اب ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا، وہ ہر قیمت پر خود مختار شہنشاہیت کے اس جابرانہ نظام کو ختم کر دینا چاہتے تھے جس نے ان کی زندگی کو رِستا ہوا ناسور بنا دیا تھا۔

آزادیٔ فکر کی تحریک جو تیزی سے پھیل رہی تھی وہ بھی نظریاتی طور پر شخصی حکومتوں کے خلاف تھی، اور جمہوری حکومتیں قائم کرنا چاہتی تھی۔

ادھر سرمایہ داروں کا طبقہ جو بادشاہوں کی سرپرستی میں پروان چڑھ رہا تھا، اب خود بادشاہوں سے بیزار ہونے لگا تھا، انہیں وہ قانونی پابندیاں ناگوار ہونے لگیں جو ان کی نفع اندوزی کو پابند کرسکیں۔ یہ طبقہ ایسا نظامِ حکومت لانا چاہتا تھا جس میں تجارت وصنعت بالکل آزاد ہو، اور سرمایہ داروں کی حکمتِ عملی کے تابع ہو۔

انقلابِ فرانس

ان تینوں عوامل نے جمع ہوکر خود مختار شاہی کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر دیا، تاآنکہ ۱۷۸۹ء کا ''انقلابِ فرانس'' خود مختار شاہی پر ایک فیصلہ کن ضرب لگاتا ہوا نمودار ہوا، اور اُٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے زمانے میں یورپ کے اکثر ممالک میں جمہوری حکومتیں قائم ہوتی چلی گئیں ـــــ مگر ـــــ

سرمایہ داروں کا سیاسی اقتدار

سرمایہ دار طبقہ چونکہ تمام وسائل معاش اور ملکی دولت پر قابض تھا اور تحریک

جمہوریت میں یہ بھی مؤثر طاقت بن کر شامل ہوا تھا اسی لئے یہی ان جمہوری حکومتوں پر بھی قابض ہوگیا۔

مذہب کو تو پہلے ہی چھٹی دی جاچکی تھی، اب سیاسی اقتدار ہاتھ میں آجانے کے بعد اس طبقے پر کوئی قانونی یا اخلاقی پابندی بھی باقی نہ رہی، اس نے ذاتی نفع اندوزی کی حرص میں مزدور کے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا۔

سرمایہ داروں کی اجارہ داری

اس طرح نظامِ سرمایہ داری یورپ پر اپنے ان تمام لوازم وثمرات کے ساتھ مسلط ہوگیا جن کا ذکر ہم ذرا پہلے کر چکے ہیں، یورپ کی کل آبادی دو طبقوں میں بٹ گئی، ایک طبقہ ان مٹھی بھر سرمایہ داروں کا تھا جو پوری دولت اور تمام وسائلِ پیداوار کے مالک تھے اور اَب حکومت کو بھی اپنی ذاتی اغراض کے تابع بنا چکے تھے، دُوسرا طبقہ ان بے یار و مددگار مفلسوں کا تھا جو زیادہ سے زیادہ محنت کرکے بھی زندگی کی بنیادی ضروریات کو ترس رہے تھے۔

نظامِ سرمایہ داری کے خلاف رَدِّعمل اوراس کے اسباب

نظامِ سرمایہ داریہ کی بنیادی خرابی یہ تھی کہ اس نے ایک طرف تو ''انفرادیت'' (Individualism) پر حد سے زیادہ زور دیا کہ فرد کو پورے معاشی کاروبار میں مذہب اور قانون کی دسترس سے آزاد کرکے اس پر معاشرے کے مفادات کو بھینٹ چڑھادیا، جس کا حاصل یہ تھا کہ فرد ہی سب کچھ ہے، جماعت یا معاشرہ کچھ نہیں، فرد کی آزادی پر قومی مفدات کو قربان کردینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ دُوسری طرف ایسا کوئی بندوبست اس نظام میں موجود نہیں تھا جو اس آزادی پر کسی خاص گروہ کی

اجارہ داری قائم ہونے سے روک سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انفرادی آزادی کا فائدہ صرف سرمایہ دار نے حاصل کیا، اور مزدور و کسان عملاً بیکس و مجبور ہوکر رہ گئے۔ حد یہ ہے کہ ''زار'' کے عہد حکومت میں رُوس کے کسی کارخانے میں مزدوروں سے ساڑھے بارہ گھنٹے سے کم محنت نہیں لی جاتی تھی، اور مزدور اس جاں سوز محنت پر یہ جانتے ہوئے مجبور تھا کہ جس دن وہ اس سے انکار کرے گا اسی دن وہ روٹی کے ان سوکھے ٹکڑوں سے بھی محروم ہوجائے گا جو اس کے بال بچوں کی زندگی کا واحد سہارا رہ گئے ہیں۔

ان حالات میں جب مزدور اپنی تباہ حالی اور سرمایہ داروں کی مسلسل سنگ دِلی کا مشاہدہ کرتا تو اس کا سینہ نفرت و انتقام کے جذبات سے کھولنے لگتا۔

مزدوروں کی تحریک

مزدور طبقہ شہروں میں آباد تھا، جہاں سرمایہ داروں کے شاندار محلات اور ان کی رنگا رنگ تعیّشات دیکھ کر اسے اپنی بدحالی کا احساس اور ابھی شدّت سے ہونے لگا تھا۔ ایک عرصے تک ظلم کی چکی میں پستے رہنے کے بعد اس طبقے میں سرمایہ داروں کے خلاف ہمہ گیر جذبہ پیدا ہوا، اور انہوں نے اپنے حقوق منوانے کے لئے مزدور انجمنیں قائم کرنا شروع کردیں، اور یورپ کے بعض مفکرین مزدوروں کی اس تحریک کی حمایت کرنے لگے، پھر یہی تحریک رفتہ رفتہ اشتراکیت (Socialism) کی بھیانک صورت میں ڈھلتی چلی گئی۔

نفرت و انتقام کے یہی جذبات تھے جنہیں سوشلزم نے ہوا دے کر اپنے حق میں استعمال کیا اور مزدور تحریک جو محض مزدوروں کے حقوق منوانے کے لئے شروع ہوئی تھی، کوئی سیاسی انقلاب اس کے پیشِ نظر نہیں تھا، اسے سوشلسٹ لیڈروں نے ہڑتالوں، توڑ پھوڑ، قانون شکنی اور تشدّد میں استعمال کرکے متعدّد ممالک میں یکے بعد دیگرے سوشلسٹ انقلاب برپا کردیا۔

یہ تھا یورپ کی تاریخ کا وہ ہزار سالہ سیاسی، معاشی اور نظریاتی پسِ منظر جس کے بطن سے کمیونزم (Communism) اور سوشلزم (Socialism) نے جنم لیا۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر ہم کمیونزم اور سوشلزم کے نفسیاتی محرکات کو بہتر طریقے سے سمجھ سکیں گے۔ اگلے صفحات میں ہم سوشلزم اور کمیونزم کا قدرے تفصیلی تعارف پیش کریں گے۔

سوشلزم

(Socialism)

سوشلزم کے لغوی معنی ''اجتماعیت''، اور اصطلاحی معنی ''اشتراکیت'' ہیں۔ یہ لفظ ''انفرادیت'' کی ضد ہے، انفرادیت کا حاصل یہ تھا کہ فرد ہی سب کچھ ہے، جماعت کچھ نہیں، لہٰذا حکومت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ فرد کے معاشی معاملات میں دخل اندازی کرے۔

اور اشتراکیت کا حاصل یہ ہے کہ جماعت ہی سب کچھ ہے، فرد کچھ نہیں، لہٰذا حکومت ہی تمام وسائلِ پیداوار کی مالک ہے، وہی تمام زرعی اور صنعتی وتجارتی پالیسیاں بنانے اور نافذ کرنے کی مجاز ہے، وہی افراد کے پیشے معین کرنے کا حق رکھتی ہے، انفرادی طور پر کوئی شخص کسی ذریعۂ پیداوار کا مالک نہیں ہوسکتا، حکومت اس کے لئے جو پیشہ، جو ڈیوٹی اور جو اُجرت مقرّر کردے، فرد پر اس کی تعمیل واجب ہے۔

نام ہی سے ظاہر ہے کہ سوشلزم اس حد سے گزری ہوئی ''انفرادیت'' کا رَدِّعمل ہے جس پر نظامِ سرمایہ داری نے اپنا تانا بانا بُنا تھا۔

سوشلزم اور کمیونزم ایک ہی فلسفے کے دو درجے ہیں، کمیونزم سوشلسٹوں کا منتہائے مقصود ہے اور سوشلزم اس کے راستے کی ایک منزل، بس اس سے زیادہ کوئی فرق ان دونوں میں نہیں۔ اسی لئے ان دونوں اصطلاحوں کو بکثرت ایک دُوسرے کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے، اسی فرق کو ہم موقع ہوا تو آگے کسی جگہ بیان کریں گے۔

یہ ایک مستقل نظریۂ حیات ہے

بعض حضرات ناواقفیت سے سوشلزم اور اشتراکیت کو صرف ایک مخصوص معاشی نظام کی حیثیت سے جانتے ہیں جس میں مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کی علم برداری، سرمایہ داری کی بیخ کنی، دولت کی مساویانہ تقسیم اور انفرادی ملکیت کے خاتمے سے زیادہ کچھ نہیں سمجھا جاتا، حالانکہ اشتراکیت صرف معاشی یا سیاسی نظام نہیں بلکہ یہ ایک مستقل فلسفہ اور تمام مذاہب سے مختلف ایک الگ نظریۂ حیات ہے۔

جس طرح اسلام چند عقائد و عبادات یا چند قوانین کا نام نہیں بلکہ ایک کامل مرتب اور مربوط نظامِ حیات ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبے کی مکمل تنظیم کرتا ہے، اسی طرح اشتراکیت (سوشلزم) بھی ایک نظریۂ زندگی ہے جو سیاست و معیشت، اخلاق و معاشرت اور مابعد الطبیعی تخیلات و عقائد میں دُنیا کے تمام مذاہب سے یکسر مختلف ہے۔

جس اشتراکیت سے ہم بحث کر رہے ہیں اسے جرمنی کے مشہور انقلابی مفکر ''کارل مارکس'' اور اس کے ساتھی ''فریڈرک انجلز'' نے مرتب کیا ہے۔ کارل مارکس نے اسے ایک مرتب اور دقیق فلسفہ بنادیا ہے، جس میں تاریخی انقلابات کی تعبیر بھی نئے ڈھنگ سے کی گئی ہے، اس فلسفے نے انسانی تاریخ میں ایک نیا بہاؤ پیدا کیا اور یہی ایک نئے عہد کو جنم دینے کا مدعی ہے۔ نیز اسی فلسفے کی بنیاد پر ۱۹۱۷ء میں مشہور انقلابی لیڈر لینن نے رُوس میں زار کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر سب سے پہلی اشتراکی حکومت قائم کی۔ اور ''اشتراکی حکومت'' کا مطلب اس فلسفے کی رُو سے ایسی ''آمریت'' (ڈکٹیٹرشپ) ہے جو نہ خدا کے سامنے جوابدہ سمجھی جائے، نہ عوام کے سامنے، جو کسی مذہب کی پابند ہو نہ اخلاق کی، آئین کی پابند ہو نہ قانون کی۔ ایک ایسی آمریت جو عوام کے انتخاب کے بجائے محض طاقت اور تشدّد کے ذریعہ اقتدار حاصل کرلے اور انفرادی آزادیوں کا خاتمہ کر ڈالے۔ اس کے ہر حکم کی بلاچوں و چرا تعمیل

کی جائے اور کسی کو سرتابی کی مجال نہ ہو۔

نظام سرمایہ داری فرد کو آزادی دینے میں اگر ایک انتہا پر تھا تو سوشلزم نے اس کے مقابلے میں بالکل دوسری انتہا پر پہنچ کر دم لیا کہ اس نے انفرادی آزادی کی اس بے لگامی ہی کا ازالہ نہیں کیا، جس نے نظام سرمایہ داری کو پروان چڑھایا تھا، بلکہ ہر فرد کی وہ فطری آزادی بھی سلب کرلی جو اس کے انسان ہونے کا طبعی تقاضا تھی اور جسے تاریخِ عالم کے تمام مذاہب اور نظام ہائے حیات تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔

سوشلزم نے تمام وسائلِ پیداوار کی ملکیت اور سیاست و معیشت کے تمام اختیارات مطلق العنان ڈکٹیٹرشپ کے ہاتھ میں تھما دیئے، اور اس طرح بہت سارے سرمایہ داروں کو نگل کر ایک بڑا سرمایہ دار (حکومت) وجود میں آگیا، جس نے فرد کے ساتھ وہ سلوک کیا جو کسی مشین کے بے جان پرزے کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ انسان کو پیشے کی آزادی، اظہارِ رائے کی آزادی اور انفرادی ملکیت وغیرہ کے حقوق سے بھی محروم کردیا۔

یہ محرومی صرف سرمایہ دار ہی کا مقدر نہیں بنی بلکہ اس کی زد یکساں طور پر مزدور اور کسان پر بھی پڑی، وہ بھی ہر قسم کے وسائلِ پیداوار کی ملکیت سے اسی طرح محروم کئے گئے جس طرح سرمایہ دار، پہلے اگر کوئی کسان چھوٹے سے حصۂ زمین کا مالک تھا تو اَب اس کا بھی نہ رہا، پہلے اگر مزدور اپنی مرضی سے ایک کارخانہ چھوڑ کر دُوسرے کارخانے میں مزدوری حاصل کرلیا کرتا تھا، تو سوشلزم نے اس کا یہ حق بھی سلب کرلیا، پہلے اگر وہ سرمایہ داری کے جال میں پھڑ پھڑا کر اور چیخ چلّا کر اپنا کوئی حق منوالیا کرتا تھا تو اَب اس کی بھی گنجائش نہیں رہی، کیونکہ اب کارخانوں کے مالک عام سرمایہ دار نہ تھے بلکہ خود حکومت اور افسرشاہی (Bureaucracy) تھی، جس نے ہڑتالوں اور ہر قسم کے اجتماعی مطالبات کو سنگین جرم قرار دے دیا تھا۔

غرض سوشلزم صرف سرمایہ داری کے لئے ہی نہیں بلکہ مزدور اور کسان کے

لئے بھی ایسا شکنجہ ثابت ہوا جس میں کسی کو پھڑ پھڑانے کا بھی یارا نہ تھا۔ اب وہ مزدور جس نے معاشی مساوات کے فریب میں آکر اپنا سب کچھ سوشلسٹ انقلاب کی بھینٹ چڑھا دیا تھا، سوشلزم کے شکنجے میں کس جانے کے بعد حسرت کے ساتھ سرمایہ داری کے اس جال کی طرف دیکھ رہا تھا، جہاں اس کو کم از کم پھڑ پھڑانے اور چیخنے چلاّنے کی آزادی تو حاصل تھی۔

یورپی ذہن کی انتہا پسندی

یورپ کی ہزار سالہ تاریخ میں ہم دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ وہاں کا ذہن انتہا پسند اور یک رُخا واقع ہوا ہے، جس کے نتیجے میں یورپ کا معاشرہ مسلسل ایک انتہا سے دُوسری اور دُوسری سے تیسری انتہا کے چکر لگاتا رہا ہے۔ تاریخ کا ایک غیر جانبدار طالبِ علم یورپ کے ہر شعبۂ زندگی میں اسی افراط وتفریط کا مشاہدہ کرتا ہے۔

سیاسی میدان میں انتہا پسندی

سیاسی پہلو سے ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں یورپ طوائف الملوکی کا بدترین نمونہ پیش کر رہا تھا، مرکزی حکومت برائے نام تھی، پوپ اور جاگیرداروں کے سامنے بادشاہ کی بے چارگی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ وہ تاش کا بادشاہ ہو کر رہ گیا تھا۔

مگر جب سیاسی اصلاح کی تحریک شروع ہوئی تو لامرکزیت کا علاج کسی معتدل نظام کے بجائے ''مطلق العنان بادشاہت'' کو قرار دیا گیا، جس کے نتیجے میں بادشاہوں نے مرکزی حکومتیں ہی قائم نہیں کیں بلکہ وہ خدائی اختیارات بھی استعمال کرنے لگے، انہوں نے مذہب کو بھی اپنے حکم کا پابند بنالیا، حیرت ہے کہ اس زمانے کے مفکرین[1] اور فلاسفر بھی اسی مطلق العنان شہنشاہی کا گیت گا رہے تھے۔

---

(۱) ان مفکرین میں ہوبز (Hobbs) خاص طور سے مشہور ہے، دیکھئے: ''جمہوریت اور مغربی تحریکیں'' ص:۴۲۔

پھر اس کے تلخ تجربات سے دِل برداشتہ ہونے تو تمام مفکرین یک زبان ہوکر بادشاہت ہی کو سب خرابیوں کی جڑ بتانے لگے، شخصی حکومت کو رجعت پسندی قرار دیا گیا، اور طے ہوا کہ شخصی حکومت کے بجائے جمہوری حکومت ہی سب بیماریوں کا علاج اور قومی ترقی کی ضامن ہے۔ تحریک چلی، انقلاب آئے اور ''جمہوریت کا سویرا'' تقریباً پورے یورپ پر چھا گیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ جو لامحدود اختیارات پہلے بادشاہوں کو دیئے گئے تھے وہ قوم کے ہر ہر فرد پر تقسیم ہونے چاہئیں، کوئی نظریہ، کوئی عقیدہ اور کوئی اُصول ابدی اور دائمی حیثیت نہیں رکھتا، عوام کی بھیڑ جمع ہوکر ہر باب میں کثرتِ رائے سے جو فیصلہ کردے وہی عین حق وصداقت ہے، اکثریت کے فیصلے کے خلاف ہر بات سراسر باطل اور ناقابلِ شنوائی ہے۔ (۱)

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

(اقبال مرحوم)

مگر جب یہ غیر محدود جمہوریت بھی عوام کو خوشحالی نہ دے سکی تو مفکرین کی ایک بڑی جماعت نے جمہوریت کو متعدل حدود کا پابند کرنے کی بجائے نہایت غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ صادر کیا کہ سرے سے جمہوریت ہی تمام خرابیوں کی بنیاد ہے، اس نے نظامِ سرمایہ داری کی سرپرستی کی ہے، لہٰذا پوری قوت کے ساتھ اس کا قلع قمع کردینا اَز بس ضروری ہے، عوام کی رائے کا احترام نہیں کیا جاسکتا، نہ ملکی پالیسیوں میں ان کی

---

(۱) ان لوگوں نے جمہوریت کو کیسے لامحدود اختیارات دیئے، اس کا اندازہ اس مثال سے ہوگا کہ ۴؍جولائی ۱۹۶۷ء کو انگلستان کے دارالعوام اور دارالامراء میں ۱۴ کے مقابلے ۶۹ ووٹوں کی کثرت کے ساتھ تالیوں کی گونج میں یہ قانون پاس ہوا کہ ''بالغ مرد باہمی رضامندی سے تلذذ بالمثل کرسکتے ہیں'' جس پر ملکہ الزبتھ (Elizabeth) کے دستخط ہوکر اب جوازِ لواطت انگلستان کا قانون بن گیا ہے۔

رائے لینے کی ضرورت ہے نہ حکومت کی تشکیل میں، بلکہ محض طاقت کے زور پر ایسی ہتوڑے باز ڈکٹیٹرشپ (Dictatorship) قائم ہونی چاہئے جو کسی کی نہ سنے اور جو اس کے سامنے لب کشائی کی جرأت کرے اس کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے۔ اسی فلسفے کی بنیاد پر یورپ کے متعدّد ممالک میں سوشلزم، نازی ازم (Nazism) اور فاشی ازم (Fascism) کی آمریتیں قائم ہوتی چلی گئیں۔

مذہبی میدان میں انتہاپسندی

یہی انتہاپسندی مذہب کے معاملے میں کارفرما رہی کہ قرونِ وسطیٰ میں پوپ اور پادری صرف پیشوا ہی نہیں تھے بلکہ ''مذہب سازی'' کے اختیارات بھی خود ہی استعمال کر رہے تھے، وہ پیسے لے کر جن گنہگاروں کی چاہیں ''مغفرت'' کر دیتے اور جن پر غضب متوجہ ہوجائے انہیں زندہ جلادیتے تھے۔ اس طرح یورپ ایک خدا کی بجائے سینکڑوں خداؤں کا پجاری بنا ہوا تھا۔ مذہبی تنگ نظری اس حد تک پہنچی ہوئی تکہ کہ انہیں عقل کی ہر بات مذہب کی دُشمن نظر آتی تھی۔ انہیں سرے سے علم وفن اور ادب وفلسفے ہی سے بیر ہوگیا تھا، کتنے ہی مفکرین کو محض اس جرم میں موت کے گھاٹ اُتارا گیا کہ وہ اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں علم وفکر کی شمع روشن کرنے کے مرتکب ہوئے تھے۔ مگر جب اہلِ یورپ کلیسا کی ان تاریکیوں سے نکلے تو ان کی آنکھیں ایسی خیرہ ہوگئیں کہ انہوں نے کلیسا، پوپ اور پادریوں کی اجارہ داریوں ہی کا انکار نہیں کیا بلکہ وہ خدائے حقیقی کا بھی انکار کرنے لگے، ان کی تحریکِ آزادئ فکر نے کلیسا کی غیرفطری جکڑبندیوں اور تنگ نظری ہی کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ یہ تحریک ہر عقیدے اور مذہب کو خس و خاشاک کی طرح بہالے گئی۔ سیاست و معیشت سے مذہب کو کامل طور پر بے دخل کردیا گیا، مذہب اور خدا کا نام لینے کو رجعت پسندی اور تنگ نظری کی علامت بنادیا گیا، خدا کا مذاق اُڑایا گیا، مذہب کو اقوامِ عالم کے لئے ''افیون'' کہا گیا اور خدا کے فرضی تابوت نذرِ آتش کئے گئے۔

معاشی میدان میں انتہاپسندی

یہی انتہاپسندی معاشی میدان میں نظر آتی ہے کہ قرون وسطیٰ کے یورپ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ صنعت وتجارت کو حقیر پیشہ سمجھ کر اس سے گھن کیا جاتا تھا، اور اسے ''دُنیاداری'' کا نام دے کر اس سے مجتنب رہنا ''پرہیزگاری'' کی علامت بن گیا تھا، لیکن جب صلیبی جنگوں کے دوران مسلمانوں کی صنعتی وتجارتی ترقی کو دیکھ کر اسے اپنانے کا موقع ملا تو اس پیشے کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ اسی کو ہر عزت وشرف کا معیار بنادیا۔ اب انہوں نے صرف صنعت وتجارت ہی کو وسعت نہیں دی بلکہ سود کو بھی حلال کرلیا، حالانکہ سود کی حرمت پر تاریخِ عالم کے تمام مذاہب متفق چلے آئے تھے اور اس کی معاشی تباہ کاریوں کے پیشِ نظر کسی معاشرے نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ کہاں تو وہ ''پرہیزگاری'' کہ سرے سے صنعت وتجارت ہی سے اعراض، کہاں یہ ''دُنیا داری'' کہ سود، سٹہ، قمار، آڑھت، ذخیرہ اندوزی جیسی گھناؤنی چیزوں کو بھی حلال کر کے شیرِ مادر بنالیا اور صنعت وتجارت کے پورے نظام کو گندگی کے اسی ڈھیر پر تعمیر کردیا۔ یہی وہ گھناؤنی چیزیں تھیں جن کی بدولت انفرادی ملکیت اجارہ داریوں میں تبدیل ہوئی اور عوام پر نظامِ سرمایہ داری کا پھندا تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا گیا۔

اب پھر یورپ کے مفکرین میدان میں آئے، اس مرتبہ انہوں نے سرے سے انفرادی ملکیت ہی پر ہتھوڑا چلادیا، اور اس بے دِینی کو موردِ الزام نہ ٹھہرایا جس نے انفرادی ملکیت کو ہر قید سے آزاد کر کے سود، سٹہ، قمار، آڑھت اور ذخیرہ اندوزی وغیرہ کے ذریعہ نظامِ سرمایہ داری کا تانا بانا تیار کیا تھا، فیصلہ ہوا کہ سرے سے انفرادی ملکیت ہی ختم کردینے کے قابل ہے، یہی سب خرابیوں کی جڑ ہے، جب تک وسائلِ پیداوار کی انفرادی ملکیت ختم نہ کی جائے معاشی خوش حالی کا تصور ممکن نہیں۔ غرض یہ انتہاپسندی ہی تھی جو پہلے نظام جاگیرداری کی صورت میں ظاہر ہوئی، پھر نظام سرمایہ

داری کے رُوپ میں سامنے آئی اور اَب سوشلزم کا بھوت بن کر انسانیت کا تعاقب کر رہی تھی۔

یورپ کے مفکرین نے جس افراط وتفریط کو اختیار کیا، اس کی سزا سب سے زیادہ غریب عوام کو بھگتنی پڑی جو نجات کی اُمید لے کر ان داناؤں کے پیچھے چل کھڑے ہوئے تھے جن کی لغت میں ''اعتدال'' کے لفظ کے کوئی معنی ہی نہیں تھے۔ یہ بیچارے جاگیرداری کی چکی سے نکلے تو سرمایہ داری کے جال میں پھنسے، اور اس سے نکلنے کی کوشش کی تو سوشلزم نے انہیں دبوچ لیا، اب آگے نہیں معلوم کہ انتہاپسندی ان کو کہاں لے جائے گی؟

جلالِ بادشاہی ہو یا جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دِیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
(اقبال مرحوم)

قرآنِ حکیم کا ارشاد

کاش یورپ کے مفکرین کے پیشِ نظر قرآنِ حکیم کا یہ ارشاد ہوتا:-

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ، وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِه، ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِه لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (۱)

ترجمہ:- کہ یہ میری سیدھی راہ ہے تم اس پر چلو، دُوسرے راستوں پر مت چلو کہ وہ تم کو اللہ کے راستے سے ہٹادیں گے، یہ تم سے کہہ دیا ہے تاکہ تم بچتے رہو۔

کیونکہ اسلام ہی کی راہِ مستقیم وہ راہ ہے جو سیاست کے میدان میں قوموں کو ظالم بادشاہت، غیرمعتدل جمہوریت اور مطلق العنان آمریت سے بچاتی ہوئی شاہراہِ حیات کا کام دیتی ہے۔ معاشی میدان میں نظامِ جاگیرداری، نظامِ سرمایہ داری اور

(۱) سورۂ انعام آیت:۱۵۳۔

سوشلزم کی ہر دَلدل کو دائیں بائیں چھوڑتی ہوئی سیدھی آگے چلی جاتی ہے، اس شاہراہ کا کوئی مسافر آج تک کسی جال یا دَلدل کا شکار نہیں ہوا، مگر کاش وہ اس راہ کو دیکھنے کا عزم کرلیتے۔

اُنیسویں صدی سے یورپ بلکہ نصف دُنیا کو جس انتہاپسند تحریک (سوشلزم) کا سامنا رہا، آیئے اب اس کے واضح خد و خال اور اس کے ارتقاء کے مختلف مراحل کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیں۔

سوشلزم (Socialism) اور کیپٹل ازم (Capitalism) کی قدرِ مشترک

قرونِ وسطیٰ کے تاریخی حالات سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آچکی ہے کہ یورپ میں جو فلسفۂ مادّیت اور انکارِ خدا و آخرت کا ہمہ گیر طوفان آیا درحقیقت اس کی ساری ذمہ داری اس نام نہاد عیسائیت پر عائد ہوتی ہے جسے پوپ اور پادریوں نے اپنی ناپاک اغراض کی تکمیل کے لئے سادہ لوح عوام پر مسلط کردیا تھا، یہ خودساختہ مذہب، جمود، اوہام پرستی اور عقل دُشمنی کا ایسا گھناؤنا مرکب تھا کہ جن لوگوں نے اس کے علاوہ کوئی دِینِ حق اور دِینِ سماوی دیکھا ہی نہ تھا وہ سرے سے ہر دِین سے بیزار ہوگئے، اور یہ خیال پورے یورپ میں عام ہوگیا کہ نہ خدا کا کوئی حقیقی وجود ہے، نہ مذہب کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کی دُنیاوی ترقی کو برداشت کرسکے۔ جو لوگ کسی درجے میں مذہب کے قائل رہ گئے تھے، ان کے نزدیک بھی یہ بات مُسلَّم تھی کہ مذہب اور دُنیاوی کاروبار دو الگ الگ چیزیں ہیں، ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک سیاست و معیشت اور دیگر دُنیاوی کاروبار کو پورے طور پر مذہب سے آزاد نہ کرلیا جائے۔ یہی وہ اصل الاصول تھا جس پر پہلے نظامِ سرمایہ داری (کیپٹل ازم) کی عمارت تعمیر ہوئی، اور اَب اسی اُصول پر اشتراکیت (سوشلزم) کا صور پھونکا جارہا تھا۔ بس اتنے فرق کے ساتھ کہ نظام سرمایہ داری خدا و مذہب کا منکر تھا، اور سوشلزم منکر بھی

ہے اور دُشمن بھی۔ سوشلزم کی ساری قسمیں باوجود اپنے اختلافات کے اس اُصول پر متفق ہیں۔

اشتراکیت کی اقسام

پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے، اور آگے ذرا تفصیل سے معلوم ہوگا کہ جس سوشلزم سے دُنیا دوچار ہوئی وہ محض معاشی نظام نہیں مستقل نظریۂ حیات ہے، جس میں سیاست ومعیشت اور اخلاق ومعاشرت، غرض زندگی کے تمام شعبے ایک ہمہ گیر مادّی فلسفے کے تابع ہیں، جسے کارل مارکس (Karl Marx) اور اس کے دوست اینگلز (Ennegles) نے ترتیب دیا ہے۔

اس سوشلزم کے بانیوں کی حتمی رائے یہ تھی کہ یہ نظام جمہوری اور آئینی طریقوں سے وجود میں نہیں آسکتا بلکہ اس کے لئے مسلح انقلاب ناگزیر ہے جو خالص تشدّد پر مبنی ہوگا، اس لئے غریب اور محنت کش طبقے کو منظّم کیا جائے گا، مذہب اور سرمایہ دار طبقے کے خلاف ہر ممکن طریقے سے جنگ کی جائے گی، موجودہ حکومتوں کا تختہ اُلٹ کر ان کی جگہ مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ قائم ہوگی۔ زمینیں، کارخانے اور تجارتیں ان کے مالکوں سے جبراً چھین لی جائیں گی اور جو مزاحمت کرے گا اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔ اس سوشلزم کو کئی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، ''انقلابی سوشلزم''، ''سائنٹفک سوشلزم''، ''مارکسزم''، ''بالشویزم''، ''لینن ازم'' یہ سب اسی سوشلزم کے نام ہیں۔ یہ دُنیا کے ایک بڑے حصے میں مسلح انقلابات لاکر اور بہت سے ممالک پر فوج کشی کرکے سوشلسٹ نظامِ حکومت قائم کرچکا ہے، اور آج بھی متعدّد ممالک میں مخالف قوتوں سے برسرِ پیکار ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ فتح بالآخر سوشلزم کی ہوگی، رفتہ رفتہ تمام ممالک میں انقلابات آئیں گے، مزدوروں کی آمریتیں قائم ہوں گی، جب پوری دُنیا میں انقلاب مکمل ہوجائے گا تو خودبخود (نہ جانے کس طرح) مزدوروں کی آمریتیں بھی ختم ہوجائیں گی، اور وہ کمیونسٹ معاشرہ (کمیونزم) ان کی

جگہ لے لے گا جس کی پیشین گوئی کارل مارکس نے کی ہے اور جس کی حیثیت ایک ''خیالی جنت'' کے سوا کچھ نہیں۔

یہ تو وہ سوشلزم ہے جو اس وقت موضوعِ گفتگو ہے، لیکن سوشلزم ہی کے نام سے کئی دُوسرے نظریات کارل مارکس سے پہلے سامنے آچکے تھے جو زیادہ تر معاشی مسائل کی حد تک محدود تھے، دیگر شعبہ ہائے زندگی سے ان میں کم ہی تعرض کیا گیا تھا۔ یہ نظریات انتہائی گوناگوں اور ایک دُوسرے سے مختلف تھے، تاہم دو باتیں ان میں بھی مشترک طور پر موجود تھیں، ایک یہ کہ معاشیات کا پورا نظام اور اس کے تمام اُصول و جزئیات مذہب سے کلی طور پر آزاد ہونے چاہئیں۔[1] دُوسرے یہ کہ وسائلِ پیداوار کی انفرادی ملکیت ہی (انفرادی ملکیت کی بے لگامی اور اجارہ داری نہیں) موجودہ سب خرابیوں کی جڑ ہے، اسے بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکنا ازبس ضروری ہے۔

رہا یہ سوال کہ انفرادی ملکیت کا خاتمہ کیسے کیا جائے؟ تو کارل مارکس کے برخلاف ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ کام مسلح انقلاب یا بغاوت کی بجائے پُرامن جمہوری طریقوں سے بتدریج ہونا چاہئے۔ رائے عامہ کو اس کے لئے ہموار کرنا چاہئے اور خود برسرِ اقتدار اور سرمایہ دار طبقوں کو بھی اس کام پر آمادہ کرنا چاہئے۔

مارکس سے پہلے کی اشتراکیت کو عام طور سے ''معاشی سوشلزم'' یا ''ارتقائی سوشلزم'' کہا جاتا ہے، مگر اس کا طریقِ کار مارکس جیسے انقلابی سوشلسٹوں کو ناقابلِ عمل معلوم ہوتا تھا، انہوں نے ان سوشلسٹ نظریات کو جگہ جگہ اپنے طنز و تنقید کا نشانہ بنایا، انہوں نے اس قسم کی اشتراکیت کا نام قدامت پسند یا خیالی اشتراکیت[2] رکھ چھوڑا تھا، یہ نام بھی خاصا مشہور ہوا۔

---

(۱) پیچھے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ بات نظام سرمایہ داری میں بھی مسلّم چلی آرہی ہے۔

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: ''کمیونسٹ مینی فسٹو'' ص:۶۷ تا ۸۲، اور اینگلز کی کتاب ''سوشلزم'' کا بابِ اوّل ص:۶۵ تا ۹۰، اور ''جدید کمیونزم کا ارتقا'' ص:۱۳ تا ۲۴۔

ارتقائی سوشلزم اور انقلابی سوشلزم، یہ دونوں قسمیں اسی دورِ جدید کی پیداوار ہیں اور نظامِ سرمایہ داری کے خلاف اظہارِ نفرت کے طور پر انیسویں صدی عیسوی میں نمودار ہوئی تھیں، اشتراکیت کی ایک اور قسم بھی ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، یعنی وہ اشتراکی نظریات کی تحریکیں جو یورپ کی نشأۃِ ثانیہ سے بہت پہلے مختلف ادوار میں سامنے آچکے تھے، اس قسم کو ہم اگلی سطور میں ''قدیم اشتراکی نظریات'' کے نام سے تعبیر کریں گے۔

اس طرح اشتراکیت کی تین بڑی قسمیں ہمارے سامنے آرہی ہیں:-

۱- قدیم اشتراکی نظریات۔
۲- ارتقائی یا معاشی اشتراکیت۔
۳- مارکس کی انقلابی اشتراکیت۔

پہلی اور دوسری قسم اگرچہ ہمارا موضوعِ بحث نہیں لیکن انقلابی سوشلزم کے لئے مرکزی اساس انہیں دو قسموں نے فراہم کی ہے، لہٰذا ہم پہلے ان دونوں کا مختصر حال بیان کریں گے، اور اس کے بعد تیسری قسم یعنی انقلابی سوشلزم کا بیان ہوگا جو ہمارا اصل موضوعِ بحث ہے۔

قدیم اشتراکی نظریات

افلاطون (Plato) کا اشتراکی نظریہ

اشتراکی ملکیت کا تصور ... جہاں تک تاریخ سے معلوم ہوتا ہے... سب سے پہلے افلاطون (Plato ۴۲۷ق م تا ۳۴۷ ق م) نے پیش کیا تھا، افلاطون (Plato) کی رائے تھی کہ ایسی جمہوریت قائم ہونی چاہئے جس میں اعلیٰ طبقے کے شہریوں کی املاک اور بیویاں مشترک ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ یہی اصل قوم کی شیرازہ بندی کا سنگِ بنیاد ہے۔اور یہی سب سے زیادہ مؤثر طریقہ ہے جس کے ذریعہ ذاتی اغراض کو دبا کر افراد کوقومی خدمات کے لئے وقف کیا جاسکتا ہے۔

سیاست ومعیشت کے باب میں اس کے باقی نظریات بھی جدید اشتراکیت سے بہت ملتے جلتے ہیں، مثلاً وہ افراد کے سلطنت کے تابع ہونے کا خیال بڑی حد تک انتہائی شکل میں ظاہر کرتا ہے، وہ کہتا ہے:-

۱- یہ حکومت کا حق ہی نہیں فریضہ ہے کہ وہ جملہ معاشی کاروبار کی نگرانی کرے۔
۲- ہر فرد کے لئے اس کے پیشے کی تخصیص حکومت کو کرنی چاہئے۔
۳- معمولی صنعتوں میں بھی حتی الامکان املاک کی مساوات ہونی چاہئے۔[1]

لیکن افلاطون (Plato) کی یہ تجاویز عملی جامہ نہ پہن سکیں، خود اس کے مخصوص اور قابل شاگرد اَرسطو (Aristotle ۳۸۴ ق م تا ۳۲۲ ق م) نے اس کی بڑی شد و مد سے مخالفت کی۔ اس نے کہا کہ وضعِ آئین وقوانین میں انفرادی آزادی کا

---

(۱) ''تاریخ معاشیات'' ص:۱۷، ۱۸۔

لحاظ رکھنا ضروری ہے، اور افراد کو مملکت کا انتہائی دست نگر بنا کر ان کی آزادی سلب کرنا اور ان کی جدّتِ طبع کو دبا دینا قومی مصلحت کے خلاف ہے۔ ارسطو نے اجتماعی ملکیت کی بھی سخت مخالفت کی، اور اسے قومی مفاد اور اَمنِ عامہ کے لئے مضرّت رساں قرار دیا۔ شخصی ملکیت کی طرف جو خرابیاں منسوب کی جاتی ہیں ان کے بارے میں اس نے کہا کہ یہ دراصل انسانی فطرت کی کمزوریوں اور غلط قسم کے معاشرتی قوانین کا نتیجہ ہیں، ان کمزوریوں اور قوانین کی اصلاح کردی جائے تو انفرادی ملکیت سے خرابیاں پیدا نہیں ہوں گی۔ (۱)

مزدک کا اشتراکی نظریہ

افلاطون کے بعد دُوسرا شخص ایران کا مزدک (۲) ہے، جس نے چھٹی صدی عیسوی میں (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے کچھ پہلے) انفرادی ملکیت کے خلاف آواز اُٹھائی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر قسم کی خونریزی اور عداوتیں عموماً دولت یا عورت ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، لہٰذا ان دونوں کی انفرادی ملکیت و تصرف کو ختم کردینا چاہئے۔ اس نے تمام اموال کو سب انسانوں کے لئے اور تمام عورتوں کو سب مردوں کے لئے حلال کردیا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ دونوں چیزیں صرف اللہ کی ملک ہیں، اور ان سے فائدہ اُٹھانے میں سب انسان ایسے ہی برابر کے شریک ہیں، جس طرح پانی، آگ اور خود رو گھاس سے فائدہ اُٹھانے میں۔ لہٰذا کسی چیز سے دُوسروں کو روکنا جائز نہیں ہے، بس جو شخص جو چیز جہاں سے چرا کر یا چھین لے لے اس کے لئے حلال ہے۔

---

(۱) غالباً اسی لئے اَرسطو سود کا سخت مخالف ہے، کیونکہ یہ وہ زر ہے جو انفرادی ملکیت کو اجارہ داریوں میں تبدیل کردیتا ہے۔ دیکھئے حوالہ گزشتہ ص:۲۲ تا ۲۶۔

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے۔ تاریخ ابن خلدون ج:۲ ص:۳۵۶، ۳۶۶، و ۳۵۹۔ و الملل والنحل للشہرستانی ج:۲ ص:۸۲ تا ۸۵۔ اور دیکھئے: الفہرست لابن الندیم ص:۴۹۳۔

ان خیالات کو مزدک نے اتنا پھیلایا کہ ایک خاصا بڑا فرقہ "مزدکیۃ" کے نام سے وجود میں آ گیا۔ خود بادشاہِ فارس "قباذ" بھی اس کا ہم نوا بلکہ مبلغ بن گیا تھا۔ ایک مرتبہ تو مزدک نے بھرے دربار میں بادشاہ سے یہاں تک کہہ دیا کہ:-

یہ تیری ملکہ بھی تیری نہیں بلکہ ہر شخص کو اس سے لطف اندوزی کی اجازت ہے۔[1]

لوگوں نے جب بادشاہ کو بھی اس تحریک میں ملوّث پایا تو اسے تختِ سلطنت سے معزول کر کے قید کر دیا۔

قباد کے بعد جب اس کا بیٹا نوشیرواں[2] تخت نشین ہوا تو اس نے مزدک کو ان حرکتوں کی بناء پر قتل کر دیا لیکن اس کی تحریک نے ملک کو جس خانہ جنگی اور فواحش کے سیلاب میں مبتلا کر دیا تھا، اس نے ایرانی قوم کی دیرینہ عظمتوں کو پیوندِ خاک کر کے چھوڑا۔

مرجئہ جبریہ کا اشتراکی نظریہ

اس بات سے کم لوگ واقف ہوں گے کہ تاریخِ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں بھی علمائے اسلام کو ایک ایسی تحریک سے واسطہ پڑ چکا ہے جو افلاطون اور مزدک کی طرح اموال کی انفرادی ملکیت کے خلاف اور اجتماعی ملکیت کی قائل تھی، اس تحریک کے علَم بردار "جبریہ اور مرجئہ" کے بعض فرقے تھے جن کو "الاباحیہ" کہا جاتا ہے۔

ان کا دعویٰ تھا کہ دُنیا کے تمام اموال سب انسانوں کی مشترک ملکیت ہیں، کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ کسی چیز پر اپنی انفرادی ملکیت قائم کرے۔ اور دلیل بڑی دِلچسپ تھی کہ جب حضرت آدم وحوا علیہما السلام کا انتقال ہوا تو ان کے تمام اموال

---

(۱) "رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی" ص:۳۲۔

(۲) یہ نوشیرواں وہی ہے جس کے زمانۂ حکومت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔ دیکھئے: تاریخ ابن خلدون ج:۲ ص:۳۵۹۔

کی ملکیت ان کی اولاد کی جانب مشترک اور مساوی طور پر منتقل ہوگئی۔ لہٰذا اب اگر کوئی شخص کسی چیز پر اپنی انفرادی ملکیت قائم کر کے دُوسروں کو اس سے محروم کرتا ہے تو یہ ظلم ہے، اور ہر شخص کو حق ہے کہ اس سے وہ چیز چھین لے۔

انفرادی ملکیت کو علی الاطلاق ظلم قرار دینا اور اسے لوٹ مار کر کے چھین لینے کو جائز کہنا قرآنِ کریم کی صریح آیات اور احادیثِ متواترہ کے خلاف تھا، لہٰذا اس وقت کے علماء نے اس نظریہ کو کفر قرار دیا۔

پانچویں صدی ہجری (یعنی گیارہویں صدی عیسوی) کے مشہور عالم متکلم شیخ ابوشکور السالمی اپنی کتاب "التمهيد في بيان التوحيد" میں[1] اس فرقے کا ذکر فرماتے ہیں کہ:-

> قَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّ مَالَ الدُّنْيَا كُلَّهَا مُبَاحٌ لِبَنِيْ آدَمَ، وَلَيْسَ لِأَحَدٍ أَنْ يَّمْلِكَ لِنَفْسِهٖ لِأَنَّ آدَمَ وَحَوَّاءَ لَمَّا مَاتَا فَصَارَتْ أَمْوَالُهُمَا مِيْرَاثًا لِأَوْلَادِهِمَا ..... وَهٰذَا مِنْهُمْ كُفْرٌ.
>
> ترجمہ:- بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ دُنیا کا سارا مال تمام بنی آدم کے لئے مباح ہے، اور کسی کے لئے جائز نہیں کہ کسی چیز کا مالک ہو، کیونکہ جب آدم وحوا کا انتقال ہوگیا تو ان کے سارے اموال کی وارث ان کی ساری اولاد ہوگئی..... مگر ان کا یہ کہنا کفر ہے۔
>
> آگے اس فرقے پر رَدّ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-
>
> لَوْ لَمْ يَكُنِ الْأَمْوَالُ لِلنَّاسِ ملكًا لكان لا يحلُّ المنعُ من واحد والله تعالىٰ يقول:-
>
> ترجمہ:- اگر اموال لوگوں کی ملک نہ ہوتے تو ان سے کسی کو

---

(۱) دیکھئے ص۔۱۵۰، یہ علم کلام کی مشہور کتاب ہے جو مطبع فاروقی دہلی سے بھی کافی عرصہ پہلے چھپ چکی ہے۔

روکنا جائز نہ ہوتا، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ.[1]

ترجمہ:-تم آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر نہ کھاؤ۔

وقال جل جلاله:-

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا أَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا.[2]

ترجمہ:- نیز اللہ جل جلالہ فرماتا ہے:-

اور جو مرد چوری کرے اور جو عورت چوری کرے، ان کے کردار کے عوض میں ان دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔

اسی کتاب[3] میں آگے فرقہ مرجئہ وجبریہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:-

ومنهم مَنْ قال بأنَّ أموالَ الدُّنيا مشتركةٌ بين بني ادم بسبب الوراثةِ من ادَمَ وحَوَّاءَ عليهما السلام، ومَنْ أخذ شيئًا فذٰلك حقُّه ولا يجوز لأحدٍ ان يمنعه ..... وهذا كفر.

ترجمہ:- اور ان میں سے بعض لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ آدم وحوا علیہما السلام کی وراثت کے باعث دُنیا کے اموال سب انسانوں کے مابین مشترک ہیں اور جو شخص کوئی چیز لے لے پس وہ اسی کا حق ہے، کسی کو اس سے منع کرنا جائز نہیں..... یہ عقیدہ کفر ہے۔

یہ تو وہ لوگ تھے جو یورپ کے صنعتی انقلاب اور نظامِ سرمایہ داری کے وجود میں آنے سے بھی بہت پہلے ''اشتراکی جنت'' کا خواب دیکھ رہے تھے۔

اب ہم یورپ کے ان اشتراکین کا تذکرہ کرتے ہیں جنھوں نے اُنیسویں صدی میں جبکہ سرمایہ داری نظام نے افراتفری پیدا کردی تھی، اشتراکی نظریات پیش کئے اور جن کے خیالات سے اختلاف رکھنے کے باوجود مارکس نے بھی استفادہ کیا۔

---

(۱) سورۂ بقرہ آیت:۱۸۸۔ (۲) سورۂ مائدہ آیت:۳۸۔ (۳) ص:۲۰۲۔

ارتقائی یا معاشی اشتراکیت

سینٹ سائمن (Simon از ۱۷۶۰ء تا ۱۸۲۵ء)

یہ پہلا شخص ہے جس نے اس دور میں سب سے پہلے یہ تجویز پیش کی کہ تمام وسائل پیداوار پر حکومت کا قبضہ ہونا چاہئے، اسی لئے اس کو بعض مؤرخین نے سوشلزم کا باپ قرار دیا ہے، اس کے متبعین کی یہ خواہش بھی تھی کہ سرمایہ دار طبقہ مٹ جائے اور وارثت کا قانون ختم کردیا جائے۔

رابرٹ اوین (Robert Owen از ۱۷۷۱ء تا ۱۸۵۸ء)

اسے بھی موجودہ اشتراکیت کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے، اس کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ مذہب کا یہ کہنا کہ انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے، حقیقت کے خلاف ہے، اس کے اعمال کا ذمہ دار معاشرہ ہے جس کی وہ پیداوار ہے۔ اوین کا یہی وہ اُصول ہے جسے کارل مارکس نے اپنے مادّی فلسفے میں ایک بنیاد کے طور پر استعمال کیا۔ یہ نظریہ بھی اوین ہی کا ہے کہ انسانی ترقی کی راہ میں تین بڑی بڑی رُکاوٹیں ہیں، ذاتی جائیداد، مذہب اور شادی۔

چارلس فوریر (Charles Fourier از ۱۷۷۲ء تا ۱۸۳۷ء)

اجتماعی ملکیت کے سلسلے میں اس کی تجویز یہ تھی کہ چار پانچ سو خاندانوں پر

مشتمل چھوٹی چھوٹی بستیاں قائم کر کے انہیں معاشی اور سیاسی اعتبار سے بالکل خود مختار کر دیا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اس تدبیر سے معاشی کشمکش کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس تجویز پر کسی نے عمل نہیں کیا۔

لوئی بلان (Louis Blance از ۱۸۱۳ء تا ۱۸۸۲ء)

اس کا خیال تھا کہ ملک کے ہر شخص کے لئے کام مہیا کرنا حکومت کا فریضہ ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ اپنے سرمایہ سے قومی کارخانے قائم کرے، ان کے لئے کل سامان بھی حکومت فراہم کرے اور ان کا دستور العمل بھی خود حکومت مرتب کرے، اور کچھ عرصہ تجربہ کرنے کے بعد یہ کارخانے خود مختار کر دیئے جاتے ہیں، یعنی ان کے جملہ انتظامات اور آمد و صَرف کی تقسیم وغیرہ مزدوروں اور کارکنوں کے سپرد کر دی جائے۔ اس تجویز پر بھی عمل نہیں ہوا۔

پروڈھن (Proudhan از ۱۸۰۹ء تا ۱۸۶۸ء)

اس کا فلسفہ یہ تھا کہ جائیداد خالص چوری ہے، اور ان کے مالک سب چور ہیں۔ اس کی رائے میں مشترک جائیداد کا اُصول بھی جائز نہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ زمین پر ملکیت کا حق کسی کو نہیں، اسے بٹائی یا کرایہ پر بھی نہیں دیا جا سکتا۔

یہ چند مکاتبِ فکر کا مجمل خاکہ بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے، ورنہ اور بھی متعدد خیالات تھے جو سوشلزم ہی کے نام سے اس زمانے میں پیش کئے گئے[1]، لیکن ہمیں اس ''ارتقائی یا معاشی اشتراکیت'' کی تفصیل میں جانے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ اس

---

(۱) مارکس وغیرہ نے ان تمام نظریات پر اپنی تحریروں میں شدید نکتہ چینی اور جگہ جگہ طنز کیا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے: ''کیمونسٹ مینی فیسٹو'' ص:۶۵ تا ۸۲۔ اور اینگلز کی کتاب ''سوشلزم'' ص:۷۰ تا ۹۰۔

مسلک کے تمام نظریات محض تجاویز یا اپیلوں کی صورت میں سامنے آئے اور جلد ہی ایک ایک کر کے نظروں سے اوجھل ہوتے چلے گئے اور ان سب کی جگہ اس ایک ''انقلابی سوشلزم'' نے لے لی، جو اپنے ساتھ کسی دُوسرے نظریئے کی شرکت برداشت نہیں کرتا۔[۱]

(۱) چنانچہ مارکس نے ''ارتقائی یا معاشی سوشلزم'' کے خلاف سخت جدوجہد کی، بلکہ بقول لینن: ''ان کے خلاف جہاد کر کے مارکس نے مختلف ممالک کے مزدور طبقے کی انقلابی جدوجہد کے لئے ایک ہمہ گیر مستقل طریق کار ایجاد کیا۔'' دیکھئے: لینن کا کتابچہ ''کارل مارکس اور اس کے نظریات'' ص:۷۔

مارکس کی انقلابی اشتراکیت (مارکسزم)

مارکسزم کی تین بنیادی خصوصیات

کارل مارکس کی اشتراکیت اور اس سے پہلے کی اشتراکیت میں تین نمایاں[1] فرق ہیں، ایک تو یہ کہ پہلے کی اشتراکیت کا تعلق محض لادینی معاشیات کی حد تھا، اس میں زندگی کے دُوسرے مسائل اور فلسفہ و تاریخ کو معاشیات سے مربوط نہیں کیا گیا تھا، برخلاف کارل مارکس کے کہ اس نے معاشی محرکات ہی کو زندگی کے تمام مسائل کا سرچشمہ قرار دیتے ہوئے معاشیات کو زندگی کے تمام شعبوں اور فلسفہ و تاریخ سے مربوط کردیا اور اس طرح اشتراکیت کو ایک نئے ''نظامِ زندگی'' کی بنیاد بنا کر پیش کیا، جو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی اور زندگی کے ان تمام نظاموں سے مختلف ہے جو اس سے قبل سامنے آئے تھے۔

دُوسرا فرق یہ ہے کہ پہلے کی اشتراکیت ایک ناصحانہ معاشی تجاویز تو ضرور تھی، لیکن اس کی پشت پر کوئی فلسفہ ایسا نہیں تھا جو اشتراکی نظام کو ایک منطقی اور تاریخی ضرورت ثابت کرسکے۔ نہ ایسی کوئی سائنسی بنیاد تھی جو اشتراکیت کے معاشی نظریات کی فنی توجیہ کرسکے۔ مارکس نے یہ کام کیا کہ اشتراکیت کے معاشی نظریات کی پشت پناہی کے لئے فلسفے کے منتشر خیالات کو مربوط کرکے ایک ہمہ گیر مادّی فلسفہ ترتیب

---

(۱) یہ تینوں فرق کارل مارکس، اینگلز اور لینن کی تصانیف اور تقریروں میں جابجا ملتے ہیں، مثال کے طور پر دیکھئے لینن کی منتخب تصانیف میں عنوان ''مارکسزم کے تین سرچشمے'' جلد اوّل از ص ۲۴ تا ۲۹، مطبوعہ ماسکو ۱۹۶۸ء۔

دے دیا جس کی رُو سے اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اشتراکی نظام کوئی ایسی چیز نہیں جس کا محض مطالبہ کیا جائے، بلکہ یہ تو ایک تاریخی وجوب ہے جو سرمایہ داری نظام کو مسمار کرکے جلد ہی ایک منطقی نتیجے کے طور پر ظہور میں آئے گا۔ اس نے اشتراکیت کے معاشی نظریات کی توجیہ بھی سائنسی انداز میں کی اور اشتراکیت کو تجاویز کی بجائے سائنس بنا کر پیش کیا۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ کارل مارکس کے پیش رو اشتراکیین تعلیم، اخلاقی اپیلوں، پُرامن سیاسی جدوجہد اور رائے عامہ کے ذریعہ اشتراکی نظام لانا چاہتے تھے۔ اور اس کے لئے ان کا خیال تھا کہ موجودہ بااثر طبقات اور خود اصحابِ اقتدار کو بھی ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ مگر کارل مارکس نے کہا کہ اشتراک نظام پُرامن طریقوں سے نہیں بلکہ بیشتر مواقع پر مسلح انقلاب ہی کے ذریعہ برپا ہوسکتا ہے جس کے لئے ہر ممکن تشدّد سے کسی وقت بھی گریز نہیں ہونا چاہئے۔ سرمایہ داری طبقے اور موجودہ حکومتوں سے اپیل کے کیا معنی؟ ان سے تو بھرپور جنگ ناگزیر ہے۔ مارکس نے حکومتوں اور سرمایہ دار طبقوں کو قابلِ خطاب ہی نہیں سمجھا، اس کا خطاب براہِ راست مزدوروں سے تھا کہ انقلاب کے لئے تیار ہوجاؤ، اور اس کی راہ میں جو چیز حائل ہو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکو، موجودہ حکومتیں اور پارلیمانی نظام ...جنہیں "خیالی اشتراکیین" سوشلزم کا معاشی نظام لانے کے لئے استعمال کرنے کی اُمید کر رہے ہیں... خالصتاً سرمایہ داری نظام کے آلہ کار ہیں،[۱] جن کا نام و نشان مٹادینا اشتراکیت کے تعمیری کام سے پہلے ضروری ہے۔

یہ ہیں وہ تین بنیادی خصوصیات جو مارکسی اشتراکیت کو دُوسرے اشتراکی نظریات سے ممتاز کرتی ہیں۔

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: "کیمونسٹ مینی فیسٹو" ص:۶۵ تا ۸۳۔

مارکسزم اور دیگر اشتراکی نظریات کے درمیان قدرِ مشترک

اور جو اُصول دونوں قسم کے اشتراکی نظریات میں قدرِ مشترک کے طور پر پائے جاتے ہیں، وہ دو ہیں:-

۱- مادّیت، انکارِ خدا،(۱) اور انکارِ مذہب(۲) و آخرت۔

۲- انفرادی ملکیت کا خاتمہ کر کے معاشی مساوات کا قیام۔

مارکسزم کی جامع اور مختصر تعریف

اس طرح مارکسی اشتراکیت کی مختصر تعریف جو ہم کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ:-

مارکسی اشتراکیت ایک ایسے نظامِ زندگی کا نام ہے جس کی فکری بنیاد خالص مادّی فلسفہ ہے، اور اسے نافذ کرنے کا عملی طریقِ کار

---

(۱) البتہ برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں بعض جماعتیں ''کرسچین سوشلزم'' (مسیحی اشتراکیت) کے نام سے ضرور سامنے آئی تھیں، جن کا کہنا تھا کہ عقائد و عبادات کی حد تک تو مسیحی مذہب اختیار کیا جائے اور باقی اُمور میں سوشلزم (جیسا کہ پاکستان میں ''اسلامی سوشلزم'' کے نام پر کہا جارہا ہے)، یہ بات مسیحی مذہب میں تو قابلِ قبول ہوسکتی ہے کیونکہ وہاں دین و دُنیا کی تفریق پہلے سے موجود تھی، خود اس کا کوئی معاشی نظام موجود نہ تھا، مگر جو دین پورے نظامِ زندگی پر محیط ہو وہ اس ''معجونِ مرکب'' کو لادینیت ہی قرار دے گا، کیونکہ اس مرکب کی تہ میں یہ تصوّر کارفرما ہے کہ معاشیات پر خدا کو قانون چلانے کا حق نہیں، یہ حق صرف انسانوں کا ہے، کہ وہ معاشیات کے اُصول وضع کریں۔ خود سوشلزم کے چوٹی کے مفکرین نے بھی مذہب اور سوشلزم کے اجتماع کو کبھی تسلیم نہیں کیا، چنانچہ کارل مارکس نے ''کمیونسٹ مینی فیسٹو'' میں مسیحی سوشلزم کا خوب مذاق اُڑایا ہے، دیکھئے: ص:۶۸، پھر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ عیسائیت اور سوشلزم کی یہ پیوندکاری دُنیا کے کسی حصے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

(۲) پیچھے عرض کیا جاچکا ہے کہ انکارِ مذہب تو نظامِ سرمایہ داری میں بھی تھا، لیکن وہاں صرف انکار تھا اور اشتراکیت میں مذہب کا انکار بھی ہے اور اس سے دُشمنی بھی۔

ہر ممکن تدبیر اور تشدّد ہے جس کے ذریعہ خدا و مذہب اور انفرادی ملکیت کے تصوّر کا قلع قمع کیا جاتا ہے۔

مارکس کے انقلابی خیالات جب منظرِ عام پر آئے اس وقت کے حالات ہی ایسے تھے کہ مزدور طبقے پر وہ سب سے زیادہ اثر انداز ہوئے، اس طبقے کے دِلوں میں سرمایہ داروں کے مظالم کے خلاف نفرت و انتقام کے جذبات مدّت سے پرورش پا رہے تھے، لہٰذا ان کو وہی نظریہ سب سے زیادہ اپیل کرسکتا تھا جو ان جذبات کی تسکین کا سامان مہیا کردے، جو انتہا پرستی اور نفرت و انتقام پر مبنی ہو، اور مخالفین کے مقابلے میں ہر قسم کے تشدّد کو عین اخلاق قرار دیتا ہو۔ مارکس نے اسی طلبِ عام کا جواب ایک مربوط فلسفے اور سائنس کی صورت میں مہیا کردیا تو یورپ کے متعدّد ممالک میں وہی ان کا ہیرو قرار پایا، اور اسی کا فلسفہ ان مظلوم اور جذبات سے مغلوب محنت کشوں کا دِین و مذہب بن گیا۔

مارکسزم کو دیگر اشتراکی نظریات کے خلاف بھی طویل جدوجہد کرنی پڑی، مگر اُنیسویں صدی عیسوی کے اختتام تک یورپ میں مارکسزم دیگر اشتراکی نظریات پر نمایاں غلبہ حاصل کرچکا تھا۔[1]

باقی تمام اشتراکی نظریات کے نام لیوا اگرچہ بعد میں بھی باقی رہے، لیکن وہ نظریات صرف کاغذ یا زبان پر رہ گئے اور مارکسزم ہی ایک تحریک اور ایک نظامِ زندگی کی صورت میں نمودار ہوا۔ پھر جب لینن کی سربراہی میں مارکسزم نے رُوس میں ۱۹۱۷ء کا مشہور خونی انقلاب برپا کیا اور زآر کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر پہلی سوشلسٹ ڈکٹیٹرشپ قائم کی تو اسے کامیاب بنانے کے لئے بھی مارکسزم کو نہ صرف یہ کہ دیگر اشتراکی نظریات سے مسلح جنگ کرنا پڑی بلکہ خود مارکسزم میں جو مختلف دھڑے پیدا

---

(۱) دیکھئے لینن کی مشہور تصنیف ''سوشلزم'' پٹی بورژوا اور پرولتاری ص:۲ تا ۵ مطبوعہ ماسکو ۱۹۶۸ء۔

ہو گئے تھے، ان میں بھی شدید کشمکش جاری رہی، تاہم انقلاب جوں جوں غالب ہوتا گیا دُوسرے نظریات اور سوشلزم کے ''باغی'' فرقے ہر ممکن تدبیر و تشدّد کا شکار ہو کر ختم ہوتے چلے گئے۔[1]

اس وقت سے آج تک یہی مارکسزم ہے جس کی چھاپ تمام اشتراکی نظریات پر قائم ہے، اب جہاں کہیں سوشلزم ایک تحریک یا نظام کی صورت میں موجود ہے، وہ یہی مارکسزم ہے، یہ اور بات ہے کہ دُنیا کا کوئی سوشلسٹ ملک آج تک مارکسزم کا مکمل نمونہ پیش نہ کر سکا، ہر ملک کو اپنی مقامی مجبوریوں کے باعث مارکسزم میں جزوی ترمیمیں بھی کرنی پڑی ہیں، اس طرح ہر ملک کا سوشلزم جزوی طور پر دُوسرے ملک سے مختلف ہے، تاہم بنیادی اُصولوں میں سب متفق ہیں، ہر ایک کے نزدیک مارکس کی کتاب ''داس کیپٹل'' (Dascapital) کو وہی مقام حاصل ہے جو عیسائیوں کے لئے بائبل کو، اور مسلمانوں کے لئے قرآن کو۔ اب مارکسزم، سوشلزم، کمیونزم، بالشویزم، انقلابی سوشلزم، سائنٹفک سوشلزم، ماڈرن کمیونزم اور لینن ازم، یہ ایک ہی چیز کے بہت سارے نام ہیں۔ مطلق سوشلزم اور کمیونزم کا لفظ اب اسی مارکسزم کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

کارل مارکس (Karl Marx)
کے حالاتِ زندگی
(از ۱۸۱۸ء تا ۱۸۸۳ء)

کارل مارکس (Karl Marx) کی مشہور کتاب "داس کیپٹل" (Dascapital) کی ابتدائی فصلوں کے اُردو مترجم سید محمد تقی صاحب (سابق مدیر روزنامہ "جنگ" کراچی) نے جو مارکس کے بہت مداح ہیں، ترجمے[1] کی تمہید میں کارل مارکس کے حالاتِ زندگی بھی قلم بند کئے ہیں، جہاں تک ہمیں معلوم ہے اُردو میں کارل مارکس کا یہ سب سے زیادہ تفصیلی تعارف ہے، اس کے ذریعے مارکس کی نفسیات اور اس کے فلسفے کے نفسیاتی محرکات پر اچھی روشنی پڑتی ہے، اس لئے ہم یہاں اسی کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، بڑی حد تک الفاظ بھی موصوف ہی کے رہیں گے، جہاں دُوسری کتابوں سے مدد لی جائے گی ان کا حوالہ حاشیہ میں اسی مقام پر درج کردیا جائے گا۔ ان حالاتِ زندگی کے مآخذ کے بارے میں مترجم موصوف نے لکھا ہے کہ:-

> ٹرنٹی کالج کیمبرج (Trinity College Cambridge) کے لیکچرار پروفیسر مارس دوب ایم اے نے اپنی کتاب "آن اکانمک تھیری اینڈ سوشلزم" (On Economic Thgory and Socialism) میں اپنا وہ لیکچر شائع کیا ہے جو انہوں نے

---

(۱) یہ ترجمہ اپنی تمہید کے ساتھ ۱۹۶۱ء میں انجمن ترقی اُردو پاکستان نے کراچی سے شائع کیا تھا، اس میں مارکس کے حالاتِ زندگی کے لئے دیکھئے ص:۱۶ تا ۳۲۔

مارکس پر ۱۴ر نومبر ۱۹۴۲ء کو کیمبرج یونیورسٹی کی معاشیات اور سیاسیات کی فیکلٹی کی نگرانی میں دیا تھا، مارکس کی زندگی کے آنے والے حالات میں اس لیکچر سے کافی مدد لی گئی ہے۔

آگے لکھتے ہیں:-

مارکس کا مستند سوانح نگار مہرنگ ہے جس کی کتاب بدقسمتی سے میرے سامنے نہیں ہے، اس لئے میں نے مذکورہ واقعات مارس دوب کے لیکچر سے لئے ہیں جن میں کہیں کہیں دوسرے ذرائع کی مدد سے کچھ اضافہ بھی کردیا گیا ہے۔

ولادت اور خاندان

''کارل ہائن ریخ مارکس'' جرمنی کے ترائریا ''ٹریوس'' نامی شہر میں ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کا تعلق ایک متوسط درجے کے یہودی خاندان سے تھا۔ مارکس کے دادا ''ربی'' (Rabbi) یعنی یہودی مذہب کے ''فقیہ'' تھے، اور ماں کے آباء واجداد بھی سو سال سے زیادہ مدت سے ''ربی'' (Rabbi) کے عہدے پر رہے تھے۔ لیکن مارکس کی عمر جب چھ سال ہوئی تو اس کے والد نے جو وکیل تھے ''پروٹسٹنٹ عیسائی'' مذہب قبول کرلیا۔

طالب علمی کی سرگرمیاں

۱۷ سال کی عمر میں مارکس کو بون یونیورسٹی (Bonn University) میں داخل کردیا گیا، جہاں اس نے قانون کا مطالعہ شروع کردیا، لیکن یہ مدت فضول کی مصروفیات میں گزر گئی، اور بیرسٹر باپ نے بیٹے کو متعدد خطوط میں اس بات پر توبیخ کی کہ وہ اپنا وقت فضول سرگرمیوں میں کیوں ضائع کرتا ہے۔ مارکس اس زمانے میں طلبہ کی انجمنِ شعراء اور ''مجالسِ مے خواراں'' کا رکن بھی رہا۔ بلکہ بون یونیورسٹی کے

ریکارڈ میں یہ دلچسپ واقعہ بھی درج ہے کہ یونیورسٹی کے حکام نے مارکس کو اس جرم میں ایک دن کے لئے قید کی سزا دی کہ وہ پوری رات شراب میں دُھت رہا اور یونیورسٹی کے امن وسکون کو غارت کردینے کا باعث بنا۔ مارکس کے ایک پڑوسی ''بیزن فان ویسٹ فیلن'' (Bezinvan West Felin) جو پریوی کونسل کے ممبر تھے ان کی لڑکی سے اس کی منگنی ہوچکی تھی، اور دونوں میں گاڑھی چھننے لگی تھی، مارکس کے سوانح نگاروں کا خیال ہے کہ بون یونیورسٹی کے ریکارڈ میں جو واقعہ درج ہے وہ اس رومان کے جذباتی ہیجان ہی کے عالَم میں ہوا تھا، مارکس نے ایک مرتبہ کشتی بھی لڑی تھی جو غالبًا نشے کی حالت میں لڑی گئی تھی۔

ان سرگرمیوں سے باپ راضی نہ تھے، انہوں نے بیٹے کو برلین یونیورسٹی (Berlin University) میں داخل کردیا جہاں مارکس نے سنجیدگی سے علوم کا مطالعہ شروع کیا۔ برلین یونیورسٹی کے زمانے کی جو مشق کی کاپیاں ہیں، ان میں کئی عشقیہ گیت بھی ملے ہیں جو مارکس نے اپنی منسوبہ کی یاد میں کہے تھے۔ ان میں سے دو جرمنی کے رسالے ''اتے توم'' میں چھپ چکے ہیں۔

مارکس قانون کا طالبِ علم تھا لیکن وہ قانون کے لیکچروں میں کم شرکت کرتا اور زیادہ وقت جرمنی کی تاریخ اور ادب کے مطالعے پر صَرف کیا کرتا۔ باپ اس بات پر ناراض تھے، مارکس کے والد میں بیماری کے باعث چڑچڑاپن پیدا ہوگیا تھا، انہوں نے بیٹے کو سخت زجر وتوبیخ پر مشتمل خطوط لکھے جن میں اس بات پر غصّے کا اظہار تھا کہ مارکس میں:

> نظم وضبط کا فقدان اور قابلِ کراہت ناساجیت[1] پائی جاتی ہے، اور یہ کہ وہ سائنس کے تمام کھیتوں میں چرتا پھرتا ہے۔

---

(۱) غالبًا مترجم نے یہ "Anti-Social" کا ترجمہ کیا ہے۔

ہیگل (Hegel) کے فلسفے سے استفادہ

یونیورسٹی میں مارکس کی توجہ کا خاص نقطہ فلسفہ تھا، جس کا اس نے وسیع مطالعہ کیا۔ مارکس یونیورسٹی میں ۱۸۳۵ء میں داخل ہوا تھا، اور اس سے صرف دس سال پہلے ہیگل (Hegel) کا انتقال ہوا تھا، اس زمانے میں جرمنی کی یونیورسٹیوں میں ہیگل کا طوطی بول رہا تھا۔ اسی دوران مارکس کو ایک سخت بیماری لاحق ہوگئی، بیماری کے اس زمانے کو اس نے فلسفہ ہیگل کے مطالعے کے لئے وقف کردیا، جس نے مارکس کو ''ہیگلی'' بنادیا۔

ہیگل کے تنقیدی[1] اندازِ بحث میں مارکس نے جو مہارت حاصل کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تنقید کی یہ ساری صلاحیتیں خود ہیگل کے خلاف استعمال ہوگئیں، اور اس نے ہیگل کے فلسفے کو اُلٹ کر رکھ دیا، اس نے یہ رائے قائم کی کہ:-

> کسی عہد کے نظریات اس عہد کے سماجی اور معاشی کردار کو متعین نہیں کرتے بلکہ خود سماجی اور معاشی حالات ہی کسی عہد کے فلسفے اور نظریئے کا تعین کرتے ہیں۔[2]

یہاں سے قدرتی طور پر ضروری معلوم ہوا کہ سماجی اور معاشی حالات کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا جائے، چنانچہ مارکس کی آئندہ سرگرمیاں اسی موضوع کے گرد گھومتی ہیں۔ مارکس ہی کا مقولہ ہے کہ:-

> ماضی میں فلسفیوں نے کائنات کی نت نئے انداز میں تشریحیں کی ہیں، اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس انداز کو یکسر بدل کر رکھ دیں۔

---

(۱) غالباً ''تنقیدی'' سے مترجم کی مراد ہیگل کا ''جدلیاتی نظریہ'' ہے، جس کا ہیگل کو موجد مانا جاتا ہے۔ رفیع۔

(۲) اس کے لئے مزید دیکھئے لینن کا مضمون ''فریڈرک اینگلز'' جو اینگلز کی کتاب ''سوشلزم'' کے دیباچہ کے طور پر شائع ہوا ہے ص:۱۱۔

باغیانہ سرگرمیاں

ڈاکٹر ہوجانے کے بعد مارکس نے ایک مضمون لکھا جس میں پروشیائی سنسر (Prussion Censors) کی مذمت کی گئی تھی، اس کے باعث یونیورسٹی میں اس کے لیکچرار بننے کے امکانات ختم ہوگئے۔ دُوسرے سال کچھ آزاد خیال تاجروں نے ایک اخبار ''رائے نشے زائٹنگ'' نکالا، اسٹاف میں ہیگل کے پیروؤں کے کلب کے ممتاز ارکان کو رکھا گیا، مارکس بھی اس پرچے میں مضمون لکھا کرتا تھا، بلکہ چند ماہ بعد اکتوبر ۱۸۴۲ء میں اسے ایڈیٹر بنادیا گیا تو وہ کولون (Cologne) چلا گیا۔[1] مگر جلد ہی اخبار کو کمیونسٹوں سے سازباز کرنے کے الزام میں حکومت نے وارننگ دی کہ اسے بند کردیا جائے گا، اس پر مارکس نے ایڈیٹری سے علیحدگی اختیار کرلی۔ لیکن ہیگل کے نوجوان پیروؤں سے برابر خط و کتابت جاری رہی اور یہ فیصلہ ہوا کہ پیرس (Paris) سے ایک اخبار نکالا جائے، اور جرمنی میں اسے خفیہ طور پر تقسیم کیا جائے۔

اس خیال سے مارکس پیرس منتقل ہوگیا، اور یہیں سے اس کی جلاوطنی کا طویل دور شروع ہوتا ہے۔

۱۸۴۲ء میں مارکس کو فرانسیسی سوشلسٹوں سے آگاہی کا موقع ملا، اسی زمانے میں اسے ''رکارڈو'' (Ricardo)، میک کلارک (Mick Clark)، آدم اسمتھ (Adam Smith)، جیمس مل (James Mill)، اور ''سے'' (Say) کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔

اینگلز (Ennegles) سے دوستی

خفیہ تقسیم کا انتظام نہ ہونے کے باعث، پیرس کا اخبار تو پہلے ہی شمارے کے بعد بند کرنا پڑا، مگر اس کے ذریعہ ۱۸۴۴ء میں اینگلز سے دوستی پیدا ہوگئی جو ایک متمول

---

(۱) ''کارل مارکس اور اس کے نظریات'' ص ۴۰۔

کارخانہ دار کا بیٹا تھا، برلین میں ہیگل کے نوجوان پیروؤں سے جو بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے اینگلز کا کافی رابطہ رہ چکا تھا، مارکس نے پہلی ہی ملاقات میں محسوس کرلیا کہ ایک ہم خیال رُوح اسے مل گئی ہے۔ اینگلز کی ملاقات نے اسے معاشی حالات کے گہرے جائزے اور سرمایہ داری نظام کی تنقید پر متوجہ کیا۔

جلاوطنی کا سلسلہ

۱۸۴۵ء میں فرانس کی حکومت نے مارکس کو پیرس سے نکال دیا اور اسے بروسیلز (Brussels) بلجیم (Belgium) میں پناہ لینی پڑی، یہاں سے اس نے اینگلز کے ساتھ انگلستان کا دورہ کیا، جہاں ٹریڈ یونینوں کی سرگرمیاں تیزی سے جاری تھیں، اس طرح پہلی بار اس نے برطانیہ کی مزدور تحریک سے واقفیت حاصل کی۔

کمیونسٹ لیگ

۱۸۴۷ء میں مارکس نے پھر انگلستان کا دورہ کیا، اور یہاں خفیہ ''کمیونسٹ لیگ'' کے جلسے میں شرکت کی، یہ ایک بین الاقوامی ادارہ تھا، اسی نے مارکس اور اینگلز کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ اس جماعت کا منشور تیار کریں، یہ منشور اگلے سال تیار ہوا، یہی وہ منشور تھا جو ''کمیونسٹ مینی فیسٹو'' (Communist Mani Festo) کے نام سے مشہور و معروف ہے، اور مارکسزم اور کمیونزم کا ''سب سے زیادہ عظیم'' منشور شمار کیا جاتا ہے۔[1]

مارکس کو ۱۸۴۸ء میں بلجیم کی حکومت نے بھی بروسیلز سے نکل جانے کا حکم

(۱) اس منشور ''کمیونسٹ مینی فیسٹو'' سے بھی ہم نے اپنے اس مقالے میں جگہ جگہ مدد لی ہے، اس منشور میں کائنات کا جدید تصور، مادّیت، طبقاتی تصادم اور پرولتاریہ طبقے کے تاریخی کام اور دوسرے مارکسی نظریوں کی توضیح و تشریح کی گئی ہے، یہ اس وقت دُنیا کے مزدوروں کے لئے پیامِ عمل اور سرمایہ داروں کے خلاف اعلانِ جنگ کی حیثیت رکھتا تھا، اس کی پہلی اشاعت ۱۸۴۸ء میں ہوئی۔ رفیع

دے دیا، یہاں سے وہ پیرس گیا اور اینگلز کے ساتھ کولون[1] (Cologne) روانہ ہوگیا جہاں اس نے جرمنی کے جمہوریت پسند سرمایہ داروں کے ایک نئے اخبار 'نیوے رائی نشے زائٹنگ'' کو ایڈٹ کرنا شروع کیا، یہ اخبار جمہوریت کے ترجمان کی حیثیت سے سامنے آیا تھا۔ ۱۸۴۹ء میں جرمنی کی حکومت نے اخبار کو بند کردیا اور مارکس کو ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر پروشیا (جرمنی) کی سرزمین سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ اخبار تو بند ہوگیا لیکن ایڈیٹر نے آخری پرچے کو سرخ رنگ میں شائع کیا۔

کولون سے اینگلز تو باغی فوج میں شرکت کے لئے بیڈن چلا گیا اور مارکس اپنے بیوی بچوں سمیت پیرس منتقل ہوگیا، اور نام بدل کر مقیم ہوگیا، پولیس نے جلد ہی اس کا پتہ چلالیا اور مارکس کو یہاں سے فرار ہوکر لندن میں پناہ لینی پڑی جو اس کی مستقل قیام گاہ ثابت ہوا، اور اپنی عمر کے بقیہ تیس سال اس نے یہیں بسر کئے۔

افلاس اور فاقہ کشی

شروع میں لندن کی قیام گاہ ساز و سامان سے آراستہ تھی، لیکن اس خرچ کو وہ برداشت نہ کرسکا اور سامان کی ضبطی تک نوبت پہنچی، لہٰذا ایک دُوسرے مکان میں منتقل ہونا پڑا، جس میں صرف دو کمرے تھے، جن میں سے ایک کمرہ باورچی خانے کا بھی کام دیتا تھا۔ اس زمانے میں اس کی آمدنی کا ذریعہ کچھ تو اخبارات کے وہ مضامین تھے جو کافی وقفوں کے بعد چھپتے۔ اس کے علاوہ مارکس ''نیویارک ٹرانیبون'' کا لندن کا نمائندہ بھی رہا، ایک بار اس نے اخبار کے صدر دفتر کو درخواست بھیجی کہ اس کی ہر خبر کا معاوضہ ۲ ڈالر کی بجائے ۴ ڈالر کردیا جائے، جو منظور نہ ہوئی۔ امریکہ کے سابق صدر جان کینیڈی نے ایک بار کہا تھا کہ:-

اگر امریکہ کا سرمایہ دار اخبار مارکس کے مطالبے کو مان لیتا تو ممکن

---

(۱) جرمنی کا معروف شہر ہے۔ ۱۲ رفیع

ہے تاریخ کا رُخ اَب سے مختلف ہوتا۔

اس کے علاوہ مارکس اپنی سسرال کی چاندی یا اوورکوٹ کو گروی رکھ کر اور اینگلز کی مسلسل مدد کے ذریعہ اپنے اخراجات چلاتا رہا، مارکس کے خاندان کے لئے یہ شدید افلاس کا دور تھا، جس سے اس کی بیوی بیمار رہنے لگی اور غربت و فاقہ کشی کی وجہ سے اس کی ایک لڑکی اور دو بچے انتقال کر گئے۔ مارکس کا سب سے بڑا لڑکا جس کی عمر ۹ سال تھی ان دو بچوں میں شامل تھا، اس کی موت نے باپ پر بڑا گہرا اثر کیا، اس وقت مارکس کے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ بیٹے کی تجہیز و تکفین کا انتظام کر سکے۔ چند دن بعد مارکس شدید بیمار ہوا اور اس نے اینگلز کو خط لکھا کہ میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں کہ دوا خرید سکوں، آخر میں لکھا تھا کہ:-

> پچھلے آٹھ دس روز میں اتنی تنگی رہی کہ میں اپنے بیوی بچوں کو صرف روٹی اور آلو ہی مہیا کر سکا، مگر آج تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اتنا بھی مہیا نہ ہو سکے گا۔

اس تمام مدّت میں مطالعے کا کام برابر جاری رہا، برٹش میوزیم میں مارکس روزانہ صبح ۹ بجے سے شام ۷ بجے تک کتابوں میں غرق رہتا: شام کا وقت لکھنے میں صَرف ہوتا، اور رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہتا، اس تمام مدّت میں ایک کے بعد دُوسرا سگریٹ برابر جلتا اور بجھتا رہتا۔

تفریحی دِلچسپیاں

لکھنے پڑھنے سے جب تھکتا تو شطرنج کھیلنے بیٹھ جاتا، لیکن بیوی کے اصرار پر اسے یہ کھیل چھوڑنا پڑتا، کیونکہ شطرنج کے دوران وہ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتا اور سارا کھیل لڑائی جھگڑے میں ختم ہو جاتا۔ کبھی کبھی اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر پکنک کے لئے چلا جاتا، جس میں اس کی وفادار خادمہ ''لنچن'' بھی ساتھ ہوتی۔

ایک رات مارکس، لائب نخت اور برونوبار (مارکس کے دوست) نے فیصلہ

کیا کہ وہ ''ٹوٹنہام کورٹ روڈ'' کی ساری طوائفوں کے کوٹھوں کا دورہ کریں گے، اس علاقے میں وہ نئے قسم کے لوگوں کی سوسائٹی میں جا پھنسے، وہاں سے بھاگ کر گیس کی لالٹینوں پر پتھر پھینکے اور پولیس نے ان کا تعاقب کیا۔

چھ سال بعد خوشدامن کی میراث میں کچھ مال ملا تو مارکس نے تھوڑا استعمالی فرنیچر خریدا، اپنے گروی شدہ کپڑے چھڑائے اور اچھے ماحول میں مکان کرایہ پر لے لیا۔

فرسٹ انٹرنیشنل کا قیام

اس جماعت کا پورا نام ''انٹرنیشنل ورکنگ منس ایسوسی ایشن'' (International Working Mens Association) ہے، یعنی ''محنت کشوں کی بین الاقوامی جماعت''۔ لندن کے ایک جلسے میں برطانوی ٹریڈ یونین کے لیڈروں اور فرانسیسی سوشلسٹوں کی تجویز پر اس مجلس کا قیام عمل میں آیا، اس کا پہلا جلسہ ۱۸۶۷ء[۱] میں ہوا۔ اس جماعت کے قیام میں مارکس نے شدید محنت کی (اب یہ جماعت فرسٹ انٹرنیشنل کے نام سے مشہور ہے)۔

اس[۲] جماعت کا نصب العین ان اشتراکی جماعتوں کو متحد کرنا تھا جو اس زمانے تک یورپ کے بیشتر ممالک میں قائم ہو چکی تھیں۔ یہ جماعتیں اپنے اپنے طریق کار کے لحاظ سے ایک دُوسرے سے بہت مختلف تھیں، بعض کے نظریات ماضی قریب کے ''خیالی اشتراکیین'' کے رہینِ منت تھے، بعض نے نراجی خیالات کے حامیوں مثلاً

---

(۱) ماسیمو سلواڈوری (Massimo Salvadori) نے اپنی کتاب ''جدید کیمونزم کا ارتقاء'' (The Rise Of Modern Communism) میں ۱۸۶۴ء بیان کیا ہے، دیکھئے ص:۱۸، نیز لینن نے بھی اپنی کتاب ''کارل مارکس اور اس کے نظریات'' میں ۱۸۶۴ء بیان کیا ہے۔

(۲) فرسٹ انٹرنیشنل کی آنے والی تفصیلات ''سلواڈوری'' کی مذکورہ بالا کتاب سے لی گئی ہیں۔ دیکھئے اس کا ص:۱۸و۱۹۔ رفیع

فرانسیسی پراوڈھن یا رُوسی میکائیل باکونن کا اثر قبول کیا تھا، اور بعض نے اطالوی قوم پرست میزینی اور جرمن سوشلسٹ قوم پرست لاسال کے نظریات کو اپنالیا تھا۔ ''فرسٹ انٹرنیشنل'' میں صرف چند ہی جماعتیں شامل ہوئیں جن میں مارکس کے بعد سب سے زیادہ طاقت ور شخصیت باکونن کی تھی جو انتہا درجے کے انقلابی تشدّد کا مبلغ تھا۔ مارکس اور باکونن کے درمیان اختلاف ۱۸۷۲ء میں انتہا کو پہنچ گیا اور بالآخر ۱۸۷۶ء میں فرسٹ انٹرنیشنل ٹوٹ کر ختم ہوگئی جس کے بنانے میں مارکس نے شدید محنت کی تھی۔

مارکس کی عمر کے آخری بیس سال اتنی سخت مالی مشکلات میں بسر نہیں ہوئے جتنے قیامِ لندن کے ابتدائی دس سال گزرے تھے، تاہم اینگلز کی امداد کے باوجود اس کی آمدنی غیریقینی تھی۔ ایک بار مالی مشکلات سے تنگ آکر اس نے ایک ریلوے کمپنی میں کلرکی کی ملازمت تلاش کی، ملازمت تقریباً مل ہی گئی تھی مگر ہینڈرائٹنگ خراب ہونے کے باعث کمپنی نے ملازمت دینے سے انکار کردیا۔

اس کی صحت بھی گرگئی تھی جس کی وجہ سے طبیعت میں چڑچڑاپن پیدا ہوگیا تھا، اس نے اپنی مشکلات کے بارے میں لکھا ہے:-

مجھ پر وہی مصائب پڑ رہے ہیں جو ایوب[1] پر پڑے تھے، مگر میں ان کی طرح خدا سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔

۱۸۷۰ء کے قریب اینگلز نے تقریباً پانچ ہزار روپے سالانہ مارکس کو دینا طے کیا، اور خود بھی مارکس کے قریب ایک خوبصورت مکان میں رہنے لگا، مگر اس زمانے میں مارکس کی صحت جواب دینے لگی تھی۔

مارکس کی بیوی کو سرطان تھا، ۱۸۸۱ء میں اس کا انتقال ہوگیا، جس کے غم سے مارکس کی صحت نے بالکل جواب دے دیا، مارکس کو ذات الجنب کی شکایت تھی، چھ ماہ بعد اچانک بڑی لڑکی کا انتقال ہوگیا، کچھ ہی عرصہ بعد لندن کی شدید سردی نے

---

(۱) علیہ السلام۔ ۱۲ رفیع

مارکس پر پھر حملہ کیا، پہلے زخرے کی نالیوں میں ورم ہوا، پھر ایک پھیپھڑے میں پھوڑا نکل آیا، بالآخر ۱۴رمارچ ۱۸۸۳ء کو خود مارکس بھی شدید بیماری کی حالت میں مرگیا، دفن کے بعد اس کی قبر پر اینگلز نے تقریر کی، اس تقریر کو سننے کے لئے ایک درجن سے زیادہ آدمی موجود نہ تھے۔ مارکس کی موت پر اخبار لندن ٹائمز (London Times) نے جو آج کل دی ٹائمز[1] کہلاتا ہے دواِنچ کی خبر شائع کی تھی۔

مارکس کی زندگی کے یہ حالات ہم نے قدرے تفصیل کے ساتھ اس لئے پیش کئے ہیں کہ اگر یہ حالات سامنے رہیں تو اس کے فلسفے کے بہت سے محرکات کو سمجھنا آسان ہوگا۔

مارکس کے حالاتِ زندگی میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ جب سے اس کی دوستی اینگلز سے ہوئی تھی اس وقت سے وہ دونوں زندگی بھر سوشلزم کے فلسفے اور اس کی تحریک کو آگے بڑھانے میں ایک دُوسرے کے لئے جسم و جان بنے رہے، یہی وجہ ہے کہ مارکس کے ساتھ اینگلز کو بھی ''مارکسزم'' کا بانی شمار کیا جاتا ہے، اس لئے مناسب ہوگا کہ یہاں ایک نظر اینگلز کے حالاتِ زندگی پر بھی ڈالی جائے۔

اینگلز کے حالاتِ زندگی

(اَز ۱۸۲۰ء تا ۱۸۹۵ء)

فریڈرک[1] اینگلز کی ولادت جرمنی کے صوبے ''ہائن ملن بارمن'' کے مقام پر ۱۸۲۰ء میں ہوئی، اس کا باپ ایک کارخانہ دار تھا، اور اس کا خاندان ان خاندانوں میں شامل تھا جنھوں نے جرمنی میں مشینی کتائی کی صنعت شروع کی تھی۔

اینگلز کو اَوائلِ عمر میں توپ خانے کے گارد میں تربیت کے لئے داخل کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۳۸ء میں اینگلز نے ابھی جمنازیم میں اپنی تعلیم مکمل نہیں کی تھی کہ اسے خاندانی حالات سے مجبور ہوکر ''برلین'' کے ایک تجارتی ادارے میں کلرک کی حیثیت سے کام کرنا پڑا، مگر علمی مشغلہ بھی جاری رہا۔ جب وہ جمنازیم میں تھا، اسی وقت سے وہ مطلق العنانی اور نوکر شاہی کے استبداد سے نفرت کرنے لگا تھا۔ فلسفے کے مطالعے نے اس نفرت میں اور اضافہ کر دیا۔ اس زمانے میں ہیگل کا نظریہ جرمن فلسفے پر چھایا ہوا تھا، ہیگل اس کا (بقول لینن) ہیرو بن گیا۔ برلین میں ہیگل کے ان نوجوان

---

(۱) اینگلز کے حالاتِ زندگی کا یہ خاکہ ہم ''لینن'' کے ایک مضمون سے لے رہے ہیں، جو اینگلز کی کتاب ''سوشلزم'' کے ساتھ اس کے مقدمہ کے طور پر شائع ہوا ہے، (دیکھئے کتاب ''سوشلزم'' ص: ۷ تا ۱۹)۔ البتہ بعض تفصیلات کا اضافہ ''مقدمہ داس کیپٹل'' سے کیا گیا ہے، جو داس کیپٹل کی ابتدائی فصلوں کے مترجم سیّد محمد تقی صاحب (سابق مدیر روزنامہ ''جنگ'' کراچی) نے کارل مارکس کے حالاتِ زندگی کے ضمن میں بیان کی ہیں، جہاں ان دو کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب سے مدد لی جائے گی اس کا حوالہ وہیں درج کر دیا جائے گا۔ رفیع

پیروؤں سے اس کا بہت ربط وضبط رہا جو بائیں بازو کا رُجحان رکھتے تھے۔

۱۸۴۲ء میں جبکہ اس کی عمر بائیس سال تھی، اسے انگلستان کے مشہور صنعتی شہر مانچسٹر بھیج دیا گیا، جہاں اس کے خاندان نے اپنی فرم کی ایک شاخ قائم کی تھی، اس کا باپ اس تجارتی ادارے کا حصہ دار تھا، اینگلز اس ادارے میں کام کرنے لگا، وہاں وہ مزدوروں کی بستیوں میں بھی جاتا اور ان کے افلاس اور مصیبتوں کا مشاہدہ کرتا، برطانوی مزدور طبقے کی حالت پر جو کچھ لکھا گیا تھا، اس نے اس کا مطالعہ کیا، اور اس سلسلے میں جو سرکاری دستاویزات مل سکیں ان کا بھی جائزہ لیا، اسی مطالعے اور مشاہدے کا نچوڑ اس کی وہ کتاب ہے جو ''انگلستان میں مزدور طبقے کی حالت'' کے نام سے شائع ہوئی، یہ پوری کتاب سرمایہ داری اور سرمایہ دار طبقے کے خلاف فردِ جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔

انگلستان آنے سے قبل اینگلز اشتراکی نہیں بنا تھا، مانچسٹر میں اس نے ان لوگوں سے رابطہ قائم کیا جو برطانوی مزدور تحریک میں عملی حصہ لے رہے تھے۔ اور انگریزی سوشلسٹ اخباروں کے لئے لکھنا شروع کردیا۔ ۱۸۴۳ء میں اس نے رابرٹ اوون[1] (Robert Owen) کے لئے ایک مقالہ لکھا، جس کا عنوان تھا: ''نئی اخلاقی دُنیا''۔ چارٹسٹ گروہ کا ترجمان ''ناردرن اسٹار'' (Northern Star) خاص طور پر اینگلز کی توجہ کا مرکز بنا، اور اس نے اس اخبار میں متعدّد مضامین لکھے۔

مارکس سے دوستی

مارکس سے اینگلز کی پہلی ملاقات پیرس میں ۱۸۴۴ء میں ہوئی، اس سے پہلے دونوں میں خط وکتابت جاری تھی، مارکس پیرس میں فرانسیسی سوشلسٹوں کے زیرِ اثر سوشلسٹ بن چکا تھا، یہاں دونوں دوستوں نے مل کر ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے

---

(۱) اسے بھی موجودہ سوشلزم کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے، اس کے نظریات کا خلاصہ پیچھے ''ارتقائی یا معاشی اشتراکیت'' کے عنوان میں آچکا ہے۔ رفیع

''مقدس خاندان، یا ناقدانہ تنقید کی تنقید'' اس کا بیشتر حصہ مارکس نے لکھا تھا۔

اینگلز کی ملاقات نے مارکس کو سیاسی معیشت کے گہرے جائزے اور سرمایہ داری نظام کی تنقید پر متوجہ کیا۔ اینگلز برطانیہ کے حالات سے گہری واقفیت رکھتا تھا، سرمایہ داری کے انہی حالات کو مارکس نے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔

۱۸۴۵ء سے ۱۸۴۷ء تک اینگلز بروسلز (بلجیم) اور پیرس میں رہا، اور یہاں جرمن مزدوروں میں عملی جدوجہد کرتا رہا، مارکس فرانس سے ملک بدر کئے جانے کے بعد بروسلز میں پناہ لے چکا تھا، یہاں سے مارکس نے اینگلز کے ساتھ برطانیہ کا پہلی بار دورہ کرکے برطانیہ کی مزدور تحریک سے واقفیت حاصل کی۔ اسی زمانے میں مارکس اور اینگلز کا تعلق خفیہ کمیونسٹ لیگ سے قائم ہوا، جو ابتداء میں صرف جرمنوں تک محدود تھی مگر آگے چل کر بین الاقوامی[1] بن گئی، اور اسی لیگ کی ہدایت پر دونوں نے مل کر ۱۸۴۸ء میں ''کمیونسٹ مینی فیسٹو'' تیار کیا جو مارکسزم اور کمیونزم کا ''عظیم ترین منشور'' شمار کیا جاتا ہے، اور بقول لینن (Lenin) ''یہ چھوٹی سی کتاب ضخیم سے ضخیم جلدوں کے برابر قدر و قیمت رکھتی ہے۔''

۱۸۴۸ء میں جب مارکس کو بلجیم سے بھی ملک بدر کردیا گیا تو اینگلز اور مارکس دونوں اپنے وطن جرمنی واپس آگئے، اور جرمنی کے شہر ''کولون'' میں اخبار ''نیوے رائی نشے زائٹنگ'' کی ذمہ داری سنبھال لی۔ ۱۸۴۹ء میں جب جرمنی کی حکومت نے اخبار کو بند اور مارکس کو جلاوطن کیا تو مارکس اپنے بیوی بچوں سمیت پیرس چلا گیا، اور وہاں سے لندن جاکر مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اور اینگلز ''کولون'' سے جنوبی علاقے کی طرف اس فوج میں شریک ہونے کے لئے چلا گیا جو بیڈن میں بھرتی کی جارہی تھی۔ اینگلز نے مسلح بغاوت میں شرکت کی اور تین لڑائیوں میں حصہ لیا، اور جب باغیوں کو شکست ہوئی تو سوئٹزرلینڈ (Switzerland) کے راستے لندن چلا گیا۔

---

(۱) دیکھئے: دیباچہ ''کمیونسٹ مینی فیسٹو'' ص:۹۔

اینگلز مانچسٹر کے ایک تجارتی ادارے میں کلرک کی حیثیت سے کام کرنے لگا، اور بعد میں حصہ دار بن گیا۔ وہ ۱۸۷۰ء تک مانچسٹر (Manchester) میں رہا۔ اس وقت مارکس لندن میں رہتا تھا، وہ تقریباً روزانہ ایک دُوسرے کو خط لکھتے اور سوشلزم کی کتابیں لکھنے میں ایک دُوسرے کی مدد کرتے رہے۔ مارکس انٹرنیشنل کی جرمنی شاخ کا جنرل سیکریٹری تھا، اور کبھی کبھی جنرل کونسل کی صدارت بھی کرتا، صدارت کا فرض کبھی اینگلز کو بھی انجام دینا پڑتا مگر وہ مارکس کی طرح کامیاب صدر ثابت نہ ہوتا۔

جلاوطنی اور پناہ گزینی کی زندگی میں جو جھگڑے اور ذاتی مسائل پیش آتے ہیں انہوں نے مارکس اور اینگلز کو بہت پریشان کیا، چنانچہ اینگلز نے ایک مرتبہ عاجز آکر لکھا تھا کہ:-

غریب الوطنی کی زندگی اس زندگی کا نام ہے جس میں ہر شخص احمق، گدھا یا غبی ہوجانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

۱۸۷۰ء میں اینگلز مانچسٹر کے تجارتی ادارے میں اپنا حصہ فروخت کر کے لندن چلا آیا، اور مارکس کے مکان کے قریب ایک خوبصورت مکان میں رہنے لگا، اور مارکس کو بطور امداد سالانہ تین سو پچاس پونڈ دینا طے کیا۔

اس وقت سے مارکس کی موت ۱۸۸۳ء تک دونوں کا کام مشترک طور پر جاری رہا۔ مارکس نے اپنی مشہور کتاب ''داس کیپٹل'' (سرمایہ) تصنیف کی، اور اینگلز نے کئی چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔ مارکس نے سرمایہ دارانہ معیشت کے پیچیدہ مظاہر کے تجزیئے پر کام کیا، اینگلز نے ایسی کتابیں لکھیں جو علمی مناظرے سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ کتابیں مارکس کے معاشی نظریئے اور تاریخ کے جدلیاتی تصوّر کی روشنی میں لکھی گئی تھیں۔ اینگلز کی اس زمانے کی تصانیف یہ ہیں:-

تصانیف

۱- ڈوھرنگ کارد۔

۲- رُوسی حکومت کی خارجہ پالیسی پر ایک مضمون۔
۳- رہائشی سوال پر خاص مضامین۔
۴- رُوس کے معاشی ارتقاء پر دو مضمون۔

مارکس کی موت کے بعد اینگلز نے یورپی سوشلسٹوں کے رہنما اور مشیر کی حیثیت سے اپنا کام جاری رکھا، اس سے جرمنی کے سوشلسٹ ہدایتیں حاصل کرتے تھے، پسماندہ ممالک جیسے اسپین، رومانیہ اور رُوس کے نمائندے بھی اس کی ہدایات کو قبول کرتے تھے۔

مارکس اور اینگلز رُوسی زبان بھی جانتے تھے، ان دونوں کو زارشاہی کے خلاف رُوسی انقلابیوں کی جدوجہد سے گہری دِلچسپی تھی۔

مارکس کی کتاب ''داس کیپٹل'' (سرمایہ) کی جلد اوّل پہلی بار ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی تھی، باقی جلدوں کی تکمیل اور اشاعت سے پہلے ہی مارکس کا انتقال ہوگیا، لیکن مسوّدے کی شکل میں یہ کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ اینگلز نے اپنے دوست کی موت کے بعد ''داس کیپٹل'' کی دُوسری اور تیسری جلدوں کو تیار کرنے اور شائع کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ اس نے دُوسری جلد ۱۸۸۵ء میں، اور تیسری جلد ۱۸۹۴ء میں شائع کی، اینگلز چوتھی جلد بھی تیار کر کے شائع کرنا چاہتا تھا، لیکن[1] ۱۵/اگست ۱۸۹۵ء کو اس کا بھی انتقال ہوگیا، اور کتاب نامکمل رہ گئی۔ چوتھی جلد کے مضامین ''کارل کاٹسکی'' نے اپنی الگ کتاب ''قدرِ زائد سے متعلق نظریات'' میں تحریر کئے ہیں جو تین جلدوں پر مشتمل ہے اور اینگلز کی ہدایات کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔[2]

بہرحال اس حقیقت کا اظہار لینن کے علاوہ دُوسروں نے بھی کیا ہے کہ

(۱) لینن نے تاریخ ۱۵/اگست ہی لکھی ہے، لیکن ''داس کیپٹل'' کے امریکی ایڈیشن کے ناشر ''آرنسٹ انٹرمان'' نے ۶/اگست بیان کی ہے۔ دیکھئے اس کتاب کا صفحہ: ۳۴۔

(۲) حوالہ بالا۔

''کمیونسٹ مینی فیسٹو'' کی طرح ''داس کیپٹل'' کی دُوسری اور تیسری جلد بھی مارکس اور اینگلز دونوں کی مشترک تصنیف ہے، اور یہی دو کتابیں مارکسزم کی سب سے عظیم کتابیں شمار کی جاتی ہیں۔

سرسری جائزہ

مارکس کے مذکورہ حالاتِ زندگی میں چند اُمور خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں، کیونکہ اس کے فلسفے اور پوری تحریک میں انہوں نے مؤثر کردار ادا کیا ہے، ہم یہاں ان کی صرف نشاندہی کئے دیتے ہیں۔

۱- مارکس ٹھیٹ یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اس کی ددھیال اور ننھیال میں ربی (یہودی مذہبی پیشوا) کا عہدہ عرصے سے چلا آرہا تھا، مارکس کے بچپن میں اس کے والد نے عیسائی (پروٹسٹنٹ) مذہب اختیار کرلیا تھا۔

۲- لڑکپن ہی سے اس میں آزادی، خودرائی، بدنظمی، جذباتی پن اور بقول اس کے والد کے ''قابلِ کراہت ناسماجیت'' پائی جاتی تھی۔

۳- باپ کے مزاج میں چڑچڑاپن تھا اور وہ بیٹے کی ناشائستہ حرکتوں پر اس سے ناراض رہتے تھے۔

۴- باپ کی شفقت سے بھی وہ محروم ہی رہا، پھر محبت، ہمدردی، رواداری اور ایثار نام کی کوئی چیز اسے نہ عیسائیت اور یہودیت میں کہیں ملی تھی، نہ یورپ کے سرمایہ دارانہ معاشرے میں اس کا نام ونشان تھا۔

۵- خود مارکس کا مزاج بھی چڑچڑا ہوگیا تھا، شطرنج کا سارا کھیل بھی لڑائی جھگڑے کی نذر ہوجاتا تھا۔

۶- مارکس ذہین تھا، صحافت اور فلسفہ و ادب سے شروع سے دلچسپی تھی، وہ غیرمعمولی عزم وارادے کا مالک تھا۔

۷- ہینڈرائٹنگ آخر تک خراب رہا، ریلوے کی ملازمت اسی لئے نہ مل سکی۔

۸- مارکس کی تقریباً پوری عمر بے روزگاری میں گزری، اور آخر تک افلاس، فاقہ کشی اور بیماریاں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔

۹- شروع سے مزاج باغیانہ تھا اور قانون شکنی اس کی عادت تھی، اسی لئے اس کی عمر کا بڑا حصہ جلاوطنی میں گزرا، اور پوری عمر مصائب و آلام کی نذر ہوگئی۔

۱۰- پوری عمر اسے کسی قابلِ ذکر کام میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی، جو کام شروع کیا اس میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، (اس کا فلسفہ بھی اس کی موت کے بعد ہی شہرت و مقبولیت[1] حاصل کرسکا تھا)۔

۱۱- فرسٹ انٹرنیشنل کے قیام میں مارکس نے طویل اور سخت محنت کی تھی مگر وہ بھی باہمی اختلاف و انتشار کا شکار ہوگئی۔

۱۲- اس کی زندگی میں سوائے اینگلز کے کوئی نظر نہیں آتا، جس نے اس کی صلاحیتوں کی قدر کی ہو۔

۱۳- مارکس میں ہر دلعزیزی کا فقدان تھا (شاید اس کا سبب اس کی ضدی طبیعت اور چڑچڑاپن ہو) حتیٰ کہ اس کے دفن کے وقت ایک درجن سے زیادہ آدمی اس کی قبر پر موجود نہیں تھے۔

واضح رہے کہ یہ سب باتیں کسی ''سرمایہ دار'' نے نہیں بلکہ خود مارکس کے مداحوں نے اس کی سوانح عمری میں تحریر کی ہیں۔ اور ہمارا مقصد بھی ان کو شمار کرانے سے مارکس کے خلاف کوئی ''چارج شیٹ'' قائم کرنا نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ مارکس کے نظریات کا مطالعہ کرتے وقت اس کے یہ حالات سامنے رہیں تو اس کے فلسفے کے بہت سے محرکات کو سمجھنا آسان ہوگا۔

دونوں کے حالات کا سرسری جائزہ

مارکس اور اینگلز کے حالات کا سرسری جائزہ لینے سے یہ بات نمایاں طور پر

---

(۱) اب جبکہ ۱۹۹۷ء چل رہا ہے، یہ فلسفہ بھی اپنے ہاتھوں خودکشی کرچکا ہے۔ رفیع

سامنے آتی ہے کہ اس زمانے میں انگلستان اور دیگر یورپی ممالک کے مزدور سرمایہ داری نظام کی جس چکی میں پس رہے تھے، اور جن مصائب کا ان کو سامنا تھا، مارکس اپنی موت تک خود ان مصائب میں گرفتار رہا۔

اینگلز کو معاشی مصائب سے خود تو گزرنا نہیں پڑا، لیکن اس نے انگلستان کے مزدوروں کی حالتِ زار کا بہت قریب سے تحقیقی مشاہدہ کیا تھا، اور اس کے دوست مارکس پر جو کچھ گزر رہی تھی اس کی تان بالآخر اینگلز پر ہی ٹوٹتی تھی، اس پر مستزاد یہ کہ دونوں کو جلاوطنی اور پناہ گزینی کی مسلسل صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں، جن سے عاجز آکر اینگلز نے کہا تھا کہ:-

> غریب الوطنی اس زندگی کا نام ہے جس میں ہر شخص احمق، گدھا یا غبی ہوجانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

ان حالات میں سرمایہ داری کے ظالمانہ نظام کے خلاف ان کے سینوں میں انتقام کا جو لاوا پک رہا تھا، وہ اگر ''کمیونسٹ مینوفیسٹو'' یا ''انقلابی سوشلزم'' کے فلسفے کی صورت میں ظاہر ہوا تو اس وقت کے حالات میں تعجب خیز نہیں۔ کیونکہ ان کے سامنے جو سیاسی اور معاشی نظام رائج تھا وہ انتہائی جابرانہ، عیارانہ اور ظالمانہ تھا، مارکس نے جس یہودی مذہب کی آغوش میں آنکھیں کھولی تھیں، اس کا بوداپن، اوہام پرستی، تنگ نظری اور فریب کاری اس کے سامنے تھی، اس کے گرد و پیش میں جو سب سے زیادہ رائج مذہب ''عیسائیت'' کے نام سے پھیلا ہوا تھا، اس کی خلافِ عقل اور خلافِ فطرت رسمیں، اوہام پرستی، زُہد و تقویٰ، اور ترکِ دُنیا کے رُوپ میں خالص مادّہ پرستی، اور شرمناک نفس پرستی، جنھوں نے یورپ کو تباہ کرکے چھوڑا تھا، دونوں سامنے تھیں، یہی دو مذہب تھے جن سے ان کو واسطہ پڑا، اور ان دونوں مذہبوں سے بیزاری کے تمام اسباب خود ان دونوں مذہبوں میں فراوانی کے ساتھ موجود تھے۔

اسلام یا کسی اور دِین و مذہب کا مطالعہ انہوں نے کس قدر کیا تھا؟ ان کے

حالاتِ زندگی میں اس پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ ظاہر یہی ہے کہ ان کے سامنے دِین و مذہب کے نام سے صرف دو ہی مذہب آئے، عیسائیت اور یہودیت، اور انہی کو دیکھ کر وہ یورپ کے دیگر عوام وخواص کی طرح دُنیا کے ہر دِین و مذہب سے بیزار ہوگئے۔

مارکس اور اینگلز کے نظریات میں دو چیزیں نمایاں ہیں۔ ۱-سرمایہ داری نظام کے خلاف نفرت و بغاوت۔ ۲-دِین و مذہب کی حقارت، بیزاری اور عداوت۔ اس وقت کا یورپ جس معاشی ظلم و بربریت کا شکار تھا، اور جس مذہبی اوہام پرستی سے نجات حاصل کرنے کی تگ و دو کر رہا تھا، اس میں اگر یہ دونوں دوست بھی مذہب سے بیزار ہوگئے تو اس کے اسباب وافر مقدار میں موجود تھے۔

مگر یہ ان کی جذباتیت اور یک رُخا پن تھا کہ وہ سرے سے ہر دِین و مذہب کے دُشمن ہوگئے، جبکہ انہوں نے دُوسرے اَدیان و مذاہب کو نہ دیکھا تھا، نہ ان سے واقفیت حاصل کی تھی۔

کاش! وہ یورپ میں پھیلے ہوئے خالص مادّیت کے فلسفے سے ہٹ کر اسلام کے فطری اور حقیقی عقائد اور اس کی عادلانہ سیاسی اور معاشی تعلیمات کا مطالعہ کرلیتے اور اس گہرائی کے ساتھ کرلیتے جس گہرائی کے ساتھ انہوں نے یورپ کے معاشی مسائل کا مطالعہ کیا تھا تو عجب نہیں کہ آج کی وہ دُنیا نہ ہوتی جو آج ہے، اس دُنیا کی تاریخ اور جغرافیہ دونوں بہت مختلف ہوتے۔

دُنیا کے لئے نئی صورتِ حال

یہاں تک یہ مقالہ اب سے ۳۲ سال پہلے تقریباً ۱۹۶۵ء میں لکھا گیا تھا، اس وقت تک لینن کا لایا ہوا سوشلسٹ انقلاب جو اس نے رُوس میں زاروں کی صدیوں پُرانی حکومت کا خاتمہ کر کے ۱۹۱۷ء میں برپا کیا تھا، تقریباً نصف دُنیا کو اپنے قبضے میں لے چکا تھا، جس میں یورپ اور ایشیا کے ۲۹ مسلم ممالک[1] بھی شامل ہیں، اور اگر کیمونسٹ چین کا مقبوضہ ملک ''سنکیانگ'' (مشرقی ترکستان) بھی شامل کرلیا جائے تو یہ تیسواں ملک ہے جو سوشلزم کا شکار ہوا۔ سوشلسٹ اقتدار میں خود مزدوروں اور کسانوں پر کیا گزری؟ یہ دردناک داستان اتنی طویل ہے کہ اس پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور اُردو سمیت مختلف زبانوں میں چھپ چکی ہیں، مختصر حال پیچھے بھی آچکا ہے، لہٰذا اس داستان کا اب اتنا ہی حوالہ کافی ہے۔

پاکستان ''نظامِ جاگیرداری'' کی گرفت میں تو پہلے دن سے تھا، پھر جوں جوں اس نوزائیدہ ریاستِ خداداد میں اللہ تعالیٰ نے تجارت وصنعت کو فروغ دیا، ہمارے نااہل حکمران جو دورِ استعمار میں انگریزوں کی نوکری چاکری میں پروان چڑھے، اور تقلیدِ مغرب سے ہٹ کر کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے تھے،

---

(۱) سوشلسٹ اقتدار میں ان مسلم ممالک پر کیا بیتی؟ یہ ایک دردناک داستان ہے جس پر مختلف زبانوں میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، کچھ حال ناچیز کی کتاب ''یہ تیرے پُراسرار بندے'' میں دیکھا جاسکتا ہے، جو اصل میں جہادِ افغانستان کی مستند داستان ہے، تاہم ان ممالک کی بپتا بھی اس میں ایک حد تک آگئی ہے۔ رفیع

ان کی معاشی پالیسیاں ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کو ''نظام سرمایہ داری'' کے جال میں پھانستی چلی گئیں۔ اسی کے انتہاپسندانہ رَدِّعمل کے طور پر یہاں سوشلزم اور کمیونزم کے نعرے بھی گونجنے لگے، یہاں تک کہ ۱۹۷۰ء میں ''سوشلزم'' اور ''اسلامی سوشلزم'' کی تحریک ملک گیر طوفان کی صورت میں اُٹھ کھڑی ہوئی، اور سوشلزم جو اس وقت تک افغانستان کے حکمرانوں کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا، پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں پر بھی دستک دینے لگا تھا۔

سوشلزم کی خودکشی

افغانستان اکتیسواں مسلم ملک ہے جو سوشلزم کی درندگی کا شکار ہوا، لیکن یہی درندگی اس کے لئے خودکشی ثابت ہوئی، کیونکہ اس کی فوجیں جب ۲۷ر دسمبر ۱۹۷۹ء کو یہاں داخل ہوئیں تو رُوس کی سوشلسٹ معیشت پر، جسے کبھی بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا تھا، ۶۲ سال کی عمر میں ہی بڑھاپا آچکا تھا، پھر یہاں جس مسلم قوم سے اس کا سامنا ہوا یہ وہ قوم ہے جس کا ماضی غلامی کے ہر داغ سے پاک، اور جس کی لغت بھی شاید ''محکومی'' کے لفظ سے خالی ہے، ان غیور مسلمانوں نے اپنا سب کچھ قربان کرکے رُوسی فوج سے، جو اس وقت دُنیا کی سب سے بڑی فوج تھی، لگاتار ۱۲سال تک تاریخ ساز جہاد کیا،[1] اور آزادی کی حفاظت کے لئے اپنے ملک کے کھنڈر ہوجانے کی بھی پروانہیں کی۔ پاکستان نے بھی جس کا اقتدار اس وقت افواجِ پاکستان کے ہاتھ میں تھا، اپنی سلامتی کو داؤ پر لگا کر افغان بھائیوں کا بھرپور ساتھ دیا، بلکہ دُنیا کے بہت کم ملک ایسے ہوں گے جہاں کے مسلمانوں نے یہاں آکر ''فتح یا شہادت'' کے جذبے سے جان کی بازی نہ لگائی ہو۔ بالآخر رُوسی فوج، جس کی ستر سالہ تاریخ یہ ریکارڈ رکھتی تھی کہ وہ جس ملک میں داخل ہوگئی اسے کوئی نکال نہیں سکا، وہی فوج بُری

---

(۱) تفصیل کے لئے ناچیز کی کتاب ''یہ تیرے پُراسرار بندے'' ملاحظہ ہو۔

طرح رُسوا اور نڈھال ہوکر ۱۴رفروری ۱۹۸۹ء کو اپنے رِستے ہوئے زخموں کو چاٹتی ہوئی سرزمینِ افغانستان سے ''دریائے آمو'' پار کرگئی۔

رُوسی سوشلزم جو افغانستان میں داخل ہوتے وقت دُنیا کی ایک سپر طاقت تھا، افغانستان کے پہاڑوں سے اپنی ۱۲ سالہ قسمت آزمائی کے نتیجے میں اپنے اندر کی سیاسی اور معاشی ٹوٹ پھوٹ کا اس بُری طرح شکار ہوا کہ وہ نہ صرف یہ کہ بین الاقوامی کردار کے قابل نہ رہا، بلکہ خود اپنے وجود کو بھی نہ سنبھال سکا، اور دیکھتے ہی دیکھتے ۱۹۹۱ء میں اس کی ''سوویت یونین'' ہی دُنیا کے نقشے سے غائب ہوگئی، خود رُوس میں ''کمیونسٹ پارٹی'' کو بینڈ کردیا گیا، اور عوام نے لینن کے مجسّمے کو اپنے ہاتھوں سے گراکر پاش پاش کرڈالا، جس دیوارِ برلن نے جرمنی کو مغربی اور مشرقی جرمنی میں تقسیم کر رکھا تھا وہ زمین بوس ہوئی، درجنوں ممالک ایسے اچانک آزاد ہوئے کہ آج تک بھی ان کو اپنی آزادی کا پورا یقین نہیں آسکا، اور دُنیا نے دیکھا کہ جو سوشلزم، نظامِ سرمایہ داری کی چیرہ دستیوں کا خاتمہ کرنے چلا تھا وہ ۷۴ سال تک لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ہلاک و برباد کرکے بھی اقتصادیات و معاشیات کا کوئی ایک مسئلہ حل نہ کرسکا، خود رُوس کی معیشت جو انقلاب کے وقت ہی سے مسلسل ناکامی کا سامنا کررہی تھی بُری طرح تباہ ہوچکی تھی، چنانچہ رُوس کے صدر ''بورس یلسن'' کو بڑی حسرت سے یہ کہنا پڑا کہ:-

> کاش! سوشلزم کی ''خیالی جنت'' کا تجربہ رُوس جیسے عظیم ملک میں کرنے کے بجائے افریقہ کے کسی چھوٹے علاقے میں کرلیا گیا ہوتا، تاکہ اس کی تباہ کاریوں کو جاننے کے لئے ۷۴ سال نہ لگتے۔
>
> (نیوز دیک)

نظامِ سرمایہ داری نے ایک انتہا کو اپنایا تھا کہ نجی ملکیت کو اتنا بے لگام کردیا کہ سرمایہ داروں کو دِین و اخلاق کی ہر بندش سے آزاد کرکے عوام اور مفلوک الحال

غریبوں کا خون چوسنے کی کھلی چھوٹ دے دی، سوشلزم نے دُوسری انتہا پر پہنچ کر سرے سے نجی ملکیت ہی پر ''ہتھوڑا اور[1] درانتی'' چلادی، جو نجی ملکیت کے ساتھ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگی ہی کا صفایا کرتی چلی گئی۔

سوشلزم کی خودکشی کے نتیجے میں جو درجنوں ممالک اب تک آزاد ہوئے ہیں، ان میں یہ مسلم ممالک شامل ہیں۔ ۱-تاجکستان، ۲-ازبکستان، ۳-ترکمانستان، ۴-قرغیزستان، ۵-قزاقستان، ۶-آذربائی جان، ۷-چیچان یا شیشان، ۸-بوسنیا و ہرزیگونیا، ۹-البانیہ۔ مؤخر الذکر دو ملک یورپ میں ہیں، باقی ایشیا میں۔ ۲۱ مسلم ممالک ابھی تک آزادی کے منتظر ہیں۔

اسلامی نظام وقت کی پکار ہے

اس طرح دُنیا گھوم پھر کر پھر اسی دوراہے پر آ پہنچی ہے جہاں اس صدی کے شروع میں کھڑی تھی، جس نظامِ سرمایہ داری کی ضد پر سوشلزم وجود میں آیا تھا وہی نظام پھر پوری دُنیا پر اب اکیلا دندنا رہا ہے، اقوامِ عالَم کی بے چین نظریں پھر ایک ایسے نظامِ معیشت کی تلاش میں ہیں جو انسانیت کو سرمایہ داری نظام کے جور وستم سے نجات دِلا کر عمومی خوشحالی، حقیقی انصاف، چین وسکون اور عزّت وتحفظ فراہم کر سکے۔

دُنیا اب تیزی سے بدل رہی ہے، پورا کرۂ زمین ایک محلّے کی سی شکل اختیار کر گیا ہے، اور اس پورے گلوب پر نظامِ سرمایہ داری اپنا جال جدید ترین آلات و وسائل کے ساتھ تیزی سے پھیلا رہا ہے۔ اور ''نیو ورلڈ آرڈر'' کا صور پوری قوت سے پھونک رہا ہے۔ اس نظام کی خرابی ''نجی ملکیت'' (Private Property) میں نہیں، بلکہ نجی ملکیت کی، خالص مادّیت پر مبنی، اس غیرمحدود آزادی میں ہے جس نے

---

(۱) سوشلسٹ رُوس کا قومی نشان ''ہتھوڑا اور درانتی'' ہی ہے، اس کے جھنڈے پر بھی اس کو نمایاں مرکزی جگہ ملی ہے۔

''حلال وحرام'' کا فرق مٹا کر معاشی آزادی کے سارے میدان سرمایہ داروں کے لئے خاص کر دیئے ہیں، بازار وتجارت اور پورے نظامِ معیشت پر ان کی ''اجارہ داری'' (Monopoly) قائم کر کے وسائلِ معاش پر پہرے بٹھا دیئے ہیں، اورعوام کو انہی کی نوکری چاکری یا بے روزگاری پر مجبور کر کے ان پر مہنگائی کا ''ہمزاد'' مستقل طور پر مسلط کیا ہوا ہے۔

بازار وتجارت اور ذرائعِ معاش کی یہ آزادیاں سود و قمار، سٹے، خود غرضانہ آڑھت اور ذخیرہ اندوزی کے چور دروازوں سے کس کس طرح سلب کی گئیں؟ اور عوام پر رزقِ حلال کے دروازے جو اسلام نے ان پر چوپٹ کھول رکھے تھے، کن کن راستوں سے تنگ کئے گئے؟ یہ سب کچھ علمائے دین اور مسلم ماہرینِ معاشیات نے خوب کھول کھول کر بتادیا ہے۔ اب اُردو، عربی اور انگریزی زبانوں میں اس پر کافی لٹریچر موجود ہے، جس میں وہ عملی منصوبہ بھی برسوں کی کاوش کے نتیجے میں پیش کر دیا گیا ہے جس کے تحت بینکنگ اور انشورنس کے پورے نظام کو سود و قمار کے ظالمانہ ہتھکنڈوں کے بغیر چلا کر تقسیمِ دولت (Distribution of Wealth) کے نظام میں توازن پیدا کیا جاسکتا ہے، اور رفتہ رفتہ اسلام کا وہ عادلانہ فطری نظامِ معیشت دُنیا کے سامنے لایا جاسکتا ہے جو ''ارتکازِ دولت'' (Concentration of Wealth) کا ہر چور دروازہ بند کرتا، اور ''طلب و رسد'' (Demand and Supply) پر سرمایہ داروں کی عائد کردہ پابندیوں کا خاتمہ کر کے ایک خوشحال معیشت وجود میں لاتا ہے، اور انسانوں کو انسانوں کے سامنے جھکنے سے نجات دِلا کر انسانیت کو عمومی خوشحالی، حقیقی انصاف، چین وسکون اور عزّت وتحفظ فراہم کرتا ہے۔

نظام کتنا ہی بہتر سے بہتر کیوں نہ ہو، اور اسے دلائل سے کتنا ہی واضح کیوں نہ کر دیا جائے جب تک اسے میدانِ عمل میں لاکر نافذ کیا جائے گا اور دُنیا کو اسے تجربات کی کسوٹی پر پرکھنے کا موقع نہ ملے گا، دُنیا اس کی خوبیوں سے واقف ہوسکتی ہے

نہ وہ اپنے برگ و بار لاسکتا ہے، لہٰذا اس وقت جبکہ موجودہ نسل سوشلزم اور نظامِ سرمایہ داری کے سنگین نتائج بھگت کر ان کی افراط و تفریط سے بیزار ہو چکی ہے، عالمِ اسلام کے حکمرانوں کے لئے نادر موقع ہے کہ وہ احساسِ کمتری اور تقلیدِ مغرب کی دَلدل سے نکلیں، اسلام کی معتدل تعلیمات کی روشنی میں ان سارے چور دروازوں کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیں جن سے عوام کی معاشی آزادی و خوشحالی پر ڈاکہ ڈالا گیا ہے، اور دُنیا کو دِکھا دیں کہ اسلام جو اللہ کا آخری پیغام ہے اور امیر و غریب سب کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، وہ آج کے معاشی میدان میں بھی اپنا فطری کردار کامیابی سے ادا کر سکتا ہے اور غریبوں کی دُنیا بدل سکتی ہے۔

بے خبر! تو جوہرِ آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

دانشورانِ عالَم کے لئے لمحہ فکریہ

بلکہ ہم تو پوری خیرخواہی کے ساتھ مغرب کے ان دانشور مفکرین اور ماہرینِ معاشیات کو بھی دعوت دیتے ہیں جو انسانیت کا درد واقعی اپنے دِلوں میں رکھتے ہیں، اور ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر ہو کر خالص فنی بنیادوں پر موجودہ نظام کی خرابیوں کا علاج کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اسلام کا جو صرف ایک ''مذہب'' نہیں بلکہ ''دِین'' ہے، یعنی بنی نوعِ انسان کے لئے اللہ کا بھیجا ہوا مکمل اور لچک دار دستورِ زندگی ہے، اور اس کی معاشی تعلیمات کا گہرائی کے ساتھ، بلکہ تنقیدی جائزہ لیں، ان کے مقاصد اور منطقی نتائج کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور اس میں محقق علمائے دِین اور مسلم ماہرینِ معاشیات سے مشترکہ تعاون حاصل کریں، قوی اُمید ہے کہ خالص فنی تحقیق اور معروضی حقائق کی روشنی میں بھی وہ اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ موجودہ معاشی بگاڑ کا اگر کوئی متوازن حل انسانیت کے مقدر میں ہے تو وہ صرف ان تعلیمات ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مزدکی ہو کہ فرنگی، ہوس خام میں ہے
امنِ عالَم تو فقط دامنِ اسلام میں ہے

موجودہ خدا بیزار ظالمانہ نظام کے خلاف ایک بیتاب انقلابی لہر جنم لے چکی ہے، جس کے واضح آثار نہ صرف عالَمِ اسلام میں، بلکہ مغربی ممالک میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں، اس اُمید افزا لہر کو سنجیدہ و محقق علمائے دِین کی رہنمائی، اور مسلم حکمرانوں کی دستگیری کی ضرورت ہے، اگر اسے اسلام کی حقیقی منزل کی طرف بڑھنے سے روکا گیا، یا یوں ہی بے مہار چھوڑ دیا گیا تو یہ سنجیدہ قیادت کے قابو سے باہر ہوجائے گی، اور مذہب کے نام پر انارکی اور لاقانونیت کا راستہ اختیار کرے گی، اس کے آثار بھی آج کئی ممالک میں دیکھے جاسکتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بے قابو ہوکر دُنیا کو پھر سوشلزم جیسے انتہاپسندانہ انقلاب سے دوچار کرڈالے۔

موجودہ بگاڑ کا ''شافی حل، اسلامی حل'' وقت کی پکار ہے، جو لوگ وقت کی پکار پر کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیتے ہیں، وقت کا بے رحم سیلاب انہیں خس و خاشاک کی طرح بہالے جایا کرتا ہے۔

یہ تاریخ کا ایک سبق ہے، جو سیاست دانوں کو بھی یاد رکھنا چاہئے، حکمرانوں کو بھی، واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین
والصلوٰة والسلام علیٰ من بعث رحمةً للعالمین، خاتمًا للنبیین
وعلیٰ آلہ وأصحابہ أجمعین، إلیٰ یوم الدین.

۳/محرّم ۱۴۱۸ھ
۱۱/مئی ۱۹۹۷ء

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
خادم دارالعلوم کراچی

کتابتِ حدیث
عہدِ رسالت و عہدِ صحابہ میں
مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی
ادارۃ المعارف کراچی